ترتیب مضامین

نقوش ظہور

جذبۂ سپاس

ہم تلامذہ کی طرف سے یہ عقیدت ومحبت اور اعتراف وسپاس کے جذبات ہیں، اس احساس کے ساتھ کہ محسنوں کے کارناموں کا تذکرہ اور خدمات کا اعتراف دراصل رشتۂ وفاداری کا اظہار اور جذبۂ سپاس گزاری کی تسکین ہے۔

ادارتی

کچھ اس نمبر کے بارے میں......!!

مدیر تحریر

استاذ محترم مفتی محمد ظہور ندوی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، ۲۵ ستمبر ۲۰۱٦ء کی صبح انہوں نے اپنی حیات مستعار کی آخری سانسیں لیں اور اپنے پروردگار کے حضور حاضر ہوگئے، حضرت مفتی صاحبؒ اپنی زندگی میں بہت مشہور نہیں تو بہت گمنام بھی نہیں رہے، البتہ موت کے بعد آپ کی مقبولیت کا جو نظارہ ان گنہ گار آنکھوں نے دیکھا وہ اس بات کے لئے کافی ہے کہ بارگاہ ایزدی میں آپ کا اخلاص قبولیت کی سند پا چکا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، آپ کی بعض صفات جہاں آپ شخصیت کا عنوان بن گئیں وہیں ان کی وجہ سے دوسری صفات نظروں سے اوجھل بھی ہوگئیں، تواضع، انکساری، حاضر جوابی، فقہی جزئیات کا استحضار، اور انتظامی صلاحتیں یقیناً آپ کی شخصیت کے جلی عناوین ہیں، لیکن ان کے ساتھ صبر واستقامت، مسائل کا پامردی سے مقابلہ کرنا، مشکلات سے نہ گھبرانا، اپنی رائے پر آخر تک جمے رہنا، تعلقات نبھانا، عزیزوں کی فکر رکھنا، اہل تعلق کے ساتھ ایثار کا معاملہ، اور اس طرح کی دیگر بہت سی صفات آپ میں موجود تھیں، یہی وہ صفات ہیں جن کے بغیر 'شخصیت' کا تصور نامکمل نظر آتا ہے۔

عموماً تصنیفات شخصیات کو زندہ رکھتی ہیں، مفتی صاحب کے علمی ترکہ میں تصنیفات تو نہیں ہیں لیکن تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ہے جو ہزاروں کتابوں پر بھاری ہے، یہی تلامذہ دراصل آپ کا سب سے بڑا، اہم اور یادگار علمی سرمایہ ہیں، یہ آپ کے لئے دائمی صدقہ جاریہ بھی ہیں، ان نامور تلامذہ کے استاذ کی حیثیت سے آپ کے نام کو بقائے دوام حاصل ہو چکا ہے، اور تنہا یہ صفت آپ کو زندہ وجاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

مروہ جامعہ ام الخیر نسواں اور مروہ ایجوکیشن فاؤنڈیشن سے حضرت مفتی صاحبؒ کا تعلق رہا ہے، آپ اس کے متعدد پروگراموں میں تشریف لاتے رہے، اس

تعلق کا تقاضا تھا کہ مفتی صاحبؒ کی شخصیت اور خدمات پر ادارہ کے ترجمان ’ماہنامہ صدائے مروہ‘ کا خصوصی شمارہ شائع کیا جائے۔

ستمبر کا شمارہ پریس جانے کے لئے تیار تھا، حضرت مفتی صاحبؒ کے حادثہ فاجعہ کے بعد شمارہ کو روکا گیا، اور خصوصی شمارہ کی تیاری شروع ہوئی، کوشش کی گئی ہے کہ مطبوعہ مضمون اس شمارہ میں شامل نہ کیا جائے، اس وجہ سے غیر مطبوعہ مضامین آنے میں تاخیر ہوئی، جس کی بناء پر یہ خصوصی شمارہ دیر سے پریس جارہا ہے، صفحات کے اضافہ کے پیش نظر اسے ستمبر واکتوبر کا مشترکہ شمارہ قرار دیا گیا ہے۔

مفتی صاحبؒ کے انتقال کے بعد مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ترجمان تعمیر حیات کا خصوصی شمارہ شائع ہوا، اس شمارہ سے دوسرے لکھنے والوں کو تو تعاون ملا ہی، خود اس رسالہ کی تیاری میں اس سے فائدہ اٹھایا گیا، مشاہیر ومعاصرین کے اعترافات اور مایہ ناز تلامذہ کے خراج کے عنوان سے جو تحریریں شامل ہیں وہ زیادہ تر تعمیر حیات اور کچھ ماہنامہ المومنات سے ماخوذ ہیں، صدائے مروہ کی مجلس ادارت ان دونوں رسالوں کا ممنون ہے۔

ہم نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ مفتی صاحب کے مضامین ومقالات کو بھی اس شمارہ میں جمع کئے جائیں، کہ یہ مفتی صاحب کی علمی یادگار ہیں، ان مضامین سے مفتی صاحبؒ کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملے گی، نیز دو شخصیتوں کے مابین باہمی تعلقات کی نوعیت بھی سامنے آئے گی، اس سلسلہ میں مفتی صاحب کی ایک تقریر صرف تعمیر حیات میں ہی شائع ہوئی ہے، چنانچہ وہ تقریر تعمیر حیات کے شکریہ کے ساتھ شامل اشاعت کی جارہی ہے، اس کے علاوہ حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا محمد علاء الدین ندوی دامت برکاتہم نے اپنے مضامین جو تعمیر حیات میں شائع ہوچکے تھے، مزید ترمیم واضافہ کے ساتھ صدائے مروہ کو عنایت فرمایا، اب یہ دونوں مضامین اس شمارہ کی زینت ہیں، مفتی صاحب نے ایک مقالہ دارالعلوم کے تربیتی سیمینار میں پیش کیا جو تلاش کے باوجود نہیں مل سکا۔

ادارہ اپنے مضمون نگاران اور جملہ معاونین کا شکر گزار ہے۔

مشاہیر ومعاصرین کے اعترافات

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

”......ان سے مجھ کو شروع سے ربط رہا، زمانہ طالب علمی سے لے کر ان کی وفات تک ایک طرح سے اچھا ساتھ رہا، جو موانست ومحبت کا تعلق تھا، حالانکہ وہ زمانہ طالب علمی میں میرے ہم درس نہیں تھے، ایک دو سال قبل میں فارغ ہوا، اور اس کے فوراً بعد تعلیم وتدریس سے وابستگی کا موقع حاصل ہوا، اس کے متصل بعد مفتی صاحب مرحوم بھی دارالعلوم سے تدریسی طور پر وابستہ ہوگئے، یہ ۱۹۵۰ء کی بات رہی ہوگی، اس طویل مدت میں تعلیم وتدریس کے مرحلہ میں اچھی رفاقت رہی، اور انتظامی معاملات میں ان کے دلچسپی لینے اور ان کو جو ذمہ داریاں سپرد کی جاتی رہیں ان کو بحسن وخوبی انجام دینے کی جو صورت سامنے آئی، اس سے ان کی شخصیت کی میرے دل میں ہمیشہ سے قدر رہی، وہ بھی مجھ سے خاصے مانوس تھے، اور دوستانہ تعلق رکھتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی وفات سے میں نے ایسا ہی محسوس کیا جیسا خاندان کے کسی رفیق وعزیز کے نہ رہنے سے محسوس ہوتا ہے“۔

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمن اعظمی ندوی مدظلہ العالی

”......آٹھ دہائیوں پر مشتمل ان کی زندگی کا ہر ورق علم ودین کی خدمت سے عبارت ہے، آپ کا وجود ایک ایسا سایہ دار درخت تھا جس کے نیچے نسلیں پروان چڑھیں، ایسا چشمۂ صافی تھا جس سے تشنگان علم وفقہ سیراب ہوئے، ایسا آفتاب جس سے جس سے ایک عالم کا عالم منور ہوا......میں بذات خود بیشتر علمی، فقہی اور تنظیمی کاموں میں ان کے ساتھ شریک ہوا، میں نے پایا کہ وہ نہایت مخلص، صائب الرائے، دور بیں اور عاقبت اندیش ہیں، ندوۃ العلماء، اس کی تاریخ اور یہاں کے اسلاف سے بے انتہا محبت کرنے

والے ہیں، اور ان کے خلاف کوئی بے جا بات سننا گوارا نہیں کرتے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

''......زمانہ طالب علمی میں مفتی صاحب مرحوم سے ہمارا زیادہ تعلق نہ تھا، دارالعلوم سے عملی اور تدریسی طور پر وابستہ ہوجانے پر یہ تعلق بڑھا، اور پھر انتظامی کاموں میں ان سے مدد لی جانے لگی، لیکن سفروں سے عدم مناسبت اور جلسوں اور مجمعوں سے گریز نے ان کو نمایاں نہیں ہونے دیا اور وہ بھی اپنی طبیعت اور مزاج سے مستور رہے، باوجودیکہ فقہ کو موضوع بنا کر انہوں نے ترقی کی تھی اور مسائل کا انہیں بڑا استحضار تھا، وہ سفر کم کرتے اور وطن بھی کم جاتے، علمی مشغولیت اور ندوہ کی ذمہ داریوں سے صحیح طور پر انجام دہی کو دوسرے تقاضوں پر غالب رکھتے، اپنی اس خصوصیت میں وہ اپنے سبھی معاصرین پر فائق نظر آئے، ان کی اس خصوصیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں یہ کہنے میں تأمل نہیں کہ مفتی صاحب کی اصل خصوصیت عدم ظہور ہے۔''

مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری

......''ان کی زندگی کا تقریبا بڑا حصہ میرے سامنے رہا، ان میں زہد و تقوی اپنی مثال آپ تھی، تصوف کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ گناہوں سے نفرت اور طاعات کی طرف رغبت، یہ صفت کمال ان کو حاصل تھی، کوئی لقمہ انہوں نے اپنی زندگی میں مشتبہ مال کا نہیں کھایا ہوگا، فرائض و واجبات اور سنن و نوافل کا بے حد اہتمام تھا، دوسروں کی نفع رسانی ان کی طبیعت ثانیہ تھی، وہ اس حدیث کے مصداق تھے ''کن فی الدنیا کانك غریب اوعابر سبیل'' دنیا کو سرائے سمجھتے تھے کہ ایک مسافر خانہ ہے، مال و دولت، جاہ و مرتبہ کی خواہش گویا ان سے نکل چکی تھی، ہم نے دیکھا کہ وہ تواضع و خاکساری کا ایک عجیب نمونہ تھے، اپنی طویل زندگی میں شاید ہی ان سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو، یا کسی کی غیبت یا برائی ان کی زبان سے نکلی ہو، یہ اس دور میں بھی بہت سے صاحب طریقت کو بھی حاصل نہیں ہے، مرنجا مرنج و باغ و بہار شخصیت ان کی تھی، اخیر عمر انہوں توکل کا اعلی

نمونہ پیش کیا۔''

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

''......وہ اپنے افتاء کے میدان میں طویل مدت تک رہنے کی وجہ سے فقہ پر گہری نظر رکھتے تھے، اور علم فقہ کے ایک اہم موضوع علم الفرائض (میراث) جس کے ماہر بہت کم ہوتے ہیں، اس میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، راقم کو خود تجربہ ہے کہ مناسخہ کے پیچیدہ مسئلہ کو ایسے آسان انداز میں حل کیا کہ میں خود حیران رہ گیا، اور مرحوم کی اس مہارت کا قائل ہونا پڑا، یوں تو اس طویل رفاقت میں جو تقریبا نصف صدی پر مشتمل ہے، بارہا فقہی موضوعات پر تبادلہ خیال کی نوبت آئی، اور کبھی کبھی ان کی رائے سے اختلاف بھی کرنا پڑا مگر اکثر موافقت قائم رہی''

ڈاکٹر سید شاہ تقی الدین الدین ندوی منیری (پٹنہ)

''حضرت مفتی صاحب کا طریقہ تدریس جدید طریقہ تدریس سے مماثل تھا، اس بات کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں بی ایڈ اور ایم ایڈ کا طالب بنا، کیونکہ حضرت مفتی صاحب صرف پڑھاتے ہی نہیں تھے بلکہ ماحول بنا کر مشکل سے مشکل سبق کو آسان بناتے ہوئے فقہ اسلامی کے مضمون کو طلبا کے لئے محبوب مضمون بنا دیتے تھے، اسی لئے آپ کے تلامذہ نے فقہ اسلامی کے مضمون میں ہمیشہ امتیازی کامیابی حاصل کی''۔

مولانا محمد طاہر مدنی

''مرحوم یادگار سلف تھے، سادگی، انکساری، شرافت، شفقت اور مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ تھے، فقہ و افتاء کے ماہر اور تدریس و تربیت میں ید طولی رکھتے تھے، ۶۵ برس تک مسلسل اپنے محبوب ادارے کی خدمت کرتے رہے، اور جان جان آفریں کے سپرد کردی، اللہ تعالی مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔''

{یہ اقتباسات پندرہ روزہ تعمیر حیات اور ماہنامہ المومنات سے ماخوذ ہیں}

مایہ ناز تلامذہ کا خراج

مولانا سید سلمان حسینی ندوی (عمید کلیۃ الدعوۃ)

مجھے مفتی صاحب سے طحاوی کا کچھ حصہ پڑھنے کا موقع ملا، مفتی صاحب کے بارے میں میرا تاثر یہ رہا کہ وہ انتہائی سادہ مزاج آدمی ہیں، جہاں تک رکھ رکھاؤ کا تعلق ہے تو اس بارے میں وہ مجذوب ہیں، مطلوبہ رکھ رکھاؤ کا بھی خیال نہیں کرتے ہیں، ان کا درس انتہائی مختصر ہوتا، عبارت کی ہلکی پھلکی تشریح کرتے، کبھی کبھی ترجمہ بھی کردیتے، وہ مقرر نہیں تھے اور نہ ہی سیمینار کے آدمی تھے، البتہ انتظامی امور کے ماہر تھے، ایک زمانہ میں مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ کلیۃ الشریعہ کے عمید تھے، اور میں کلیۃ الشریعہ کا سکریٹری تھا، مولانا ابوالعرفان صاحب دفتری ذوق نہیں رکھتے، اس لئے پوری ذمہ داری میں ہی سنبھالتا تھا، ان کے انتقال کے بعد مفتی صاحب کلیۃ کے عمید بنے، مگر وہ بھی انتظامی کاموں میں محو رہتے، اور کبھی آفس میں بیٹھے بھی نہیں، جب دارالقضاء شہر سے ندوہ العلماء منتقل ہوا تو مفتی صاحب اس کے رئیس (صدر) بنے اور میں اس کا مدیر (سکریٹری)، اس تعلق سے انتظامی میٹنگوں میں مفتی صاحب کے ساتھ بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا، دارالافتاء و دارالقضاء میں پیش آنے والے اہم مسائل پر بھی مجلسیں ہوتیں، جن میں مفتی صاحب کے علاوہ دیگر اساتذہ بھی شریک ہوتے، کلیۃ الشریعہ کی جانب سے علمی مذاکرے ہوتے، میں نے ایک مذاکرہ میں مفتی صاحب سے مقالہ لکھوایا جو بہت پسند کیا گیا۔

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی (اسلامک سنٹر، آکسفورڈ یونیورسیٹی، برطانیہ)

''......فقہ کے متبحر و ثاقب نظر عالم، مفتی، دقیقہ سنج و وسیع المشرب عالم، ندوہ میں تدریس و انتظام کے رکن رکین، زہد و اخلاص کے پیکر، سادگی و تواضع کا نمونہ، استاذ محترم، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندوی نے عالم فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائی، اور مادر علمی کی فضا حزین و سوگوار ہوگئی، حادثہ جانکاہ نے اکناف عالم میں

پھیلے ہوئے آپ کے ہزاروں شاگردوں، عقیدت مندوں اور شناساؤں کو غمزدہ و دل شکستہ کردیا، راقم کے سامنے استاذ محترم کی زندگی کے طویل صفحات گردش کرنے لگے اور ''ھجرت وطیف خیالھا لم یھجر'' کی تعبیر سامنے آگئی، مفتی صاحب ندوہ کی فقہی روایت کے امین تھے، علم کی گہرائی، نظر کی وسعت اور تعصب و تنگ نظری سے پاکدامنی آپ کی فقیہانہ خصوصیات کے اہم عناوین ہیں، آپ کا سانحہ ارتحال فقہ و افتاء کا سانحہ ہے، ایک کہنہ مشق مدرس کی جدائی، ایک سنجیدہ منتظم کا فراق، ایک متواضع و سادہ مزاج انسان کا وداع ہے اور ایک خلاء ہے جسے عرصہ تک محسوس کیا جائے گا۔''

ڈاکٹر علی احمد ندوی (جامعۃ الملک عبدالعزیز، جدہ)

''......۱۹۷۰ء کا آغاز تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قدم رکھا، درجہ چہارم عربی سے جب درجہ ہفتم میں پہونچا تو حضرت مفتیؒ کے باقاعدہ شاگروں کے زمرہ میں شامل ہوا، فقہ حنفی کی مشہور و مستند کتاب 'الھدایہ' اور میراث کے مسائل پر حاوی 'سراجی' کے اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اس دوران حضرت مفتی صاحبؒ کی بے نفسی، اخلاص و حسن اخلاق کا بخوبی اندازہ ہوا، ندوہ سے فراغت کے بعد جب کبھی ملاقات ہوتی تو شفقت آمیز بلکہ محبت سے لبریز لہجہ میں 'بھئی ساحم علی' علی احمد کے بجائے کہہ کر مخاطب ہوتے اور حال چال دریافت فرماتے، گفتار کی نرمی اور کردار کی بلندی سے کون نہ متاثر ہوتا''

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی (سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، دہلی)

''ندوے میں میری طالب علمی کا دور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۳ء تک ہے، اس عرصہ میں مفتی صاحب کی پوری زندگی میری نگاہوں کے سامنے ہے، وہ میرے محسن و مربی تھے، میں نے انہیں انتہائی خلیق، شفیق، محبّ اور مخلص پایا، وہ ندوے میں استاذ فقہ و مفتی تھے، مجھے فقہ میں ان سے ہدایہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہے، اس کتاب کا بڑا حصہ انہیں ازبر تھا، کوئی طالب علم عبارت پڑھتے ہوئے غلطی کرتا، ان کے سامنے کتاب نہ ہوتی، مگر فوراً ٹوک دیتے''۔

{یہ اقتباسات پندرہ روزہ تعمیر حیات اور ماہنامہ المومنات سے ماخوذ ہیں}

سوانحی خاکہ

حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ

ماہ وسال کے آئینہ میں

۱۹۲۷ء میں مبارک پور سے متصل گاؤں سکٹھی میں پیدا ہوئے۔

۱۹۴۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔

۱۹۴۷ء میں دارالعلوم سے عالمیت مکمل کیا۔

۱۹۴۹ء میں تکمیل فقہ ودینیات کا درجہ مکمل کیا۔

۱۹۵۰ء میں دارالعلوم میں استاذ فقہ مقرر ہوئے۔

۱۹۵۳ء میں مطبخ کے ناظر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۵ء میں دارالافتاء کے صدر مفتی یعنی مفتی ندوہ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔

۱۳۹۲ھ میں حج کی سعادت سے بہرور ہوئے۔

۱۹۸۰ء میں نائب مہتمم بنائے گئے۔

۱۹۸۸ء میں عمید کلیۃ الشریعہ مقرر ہوئے۔

۱۹۹۲ء میں المعہد العالی للقضاء والافتاء کے قیام کے بعد آپ اس شعبہ کے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۹۲ء میں قاضی (رکن قاضی کانسل) مقرر ہوئے۔

۱۹۹۴ء میں حسب ضابطہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

۲۰۱۱ء میں نائب ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے۔

۲۰۱۲ء میں تدریسی ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے۔

۲۵ستمبر ۲۰۱۶ء کی صبح اپنے پروردگار حقیقی سے جاملے۔

حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ

مختصر سوانحی خاکہ

پیدائش : ۱۹۲۷ء میں مبارک پور سے متصل گاؤں سکٹھی میں پیدا ہوئے۔

ولدیت: والد کا نام عبدالستار اور دادا کا نام خان محمد ہے۔

تعلیم:

ابتدائی: اپنے گھر پر اور مدرسہ ریاض العلوم میں حاصل کی۔

متوسط: مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں میزان ومنشعب سے شرح ملا جامی تک کی تعلیم حاصل کی۔

اعلیٰ تعلیم: دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت، فضیلت، اور تکمیل فقہ و دینیات کیا۔

دارالعلوم کے اساتذہ:

آپ نے ریاض الصالحین مولانا مصطفیٰ بستویؒ سے، شرح تہذیب مولانا ابوالعرفان خان ندوی سے، ادب عربی مولانا محمد ناظم ندوی سے، مختارات، علوم قرآن، اور تفسیر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے، ہدایہ مولانا مفتی سعید ندویؒ سے، مشکوۃ المصابیح اور سنن ابوداؤد مولانا اسحٰق سندیلویؒ سے، سنن ترمذی مولانا سعید احمدؒ سے، صحیح بخاری وصحیح مسلم اور حجۃ اللہ البالغہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ سے پڑھی۔

افتاء کی تربیت:

مولانا سعید ندویؒ سے ذاتی طور پر فتوی نویسی کی تربیت لی۔

تدریسی خدمات:

نصف صدی سے زائد عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمت انجام

دی، آپ نے بہت سی کتابوں کا درس دیا جن میں ہدایہ، سراجی، طحاوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

افتاء نویسی کی خدمات:

فراغت کے بعد ۱۹۵۵ء سے تادم اخیر دارالافتاء میں فتاوی نویسی کی خدمت انجام دیتے رہے، اس درمیان ہزاروں فتاوی آپ کے قلم سے لکھے گئے۔

عہدے اور ذمہ داریاں:

مفتی ندوہ: ۱۹۵۵ء سے تاحیات اس عہدہ پر فائز رہے۔

نائب مہتمم: ۱۹۸۰ء نائب مہتمم بنائے گئے، اور نائب ناظم بننے تک یہ عہدہ باقی رہا۔

عمید کلیۃ الشریعہ: ۱۹۸۸ء میں مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ کے انتقال کے بعد عمید کلیۃ الشریعہ مقرر ہوئے اور نائب ناظم بننے تک یہ عہدہ باقی رہا۔

صدر المعہد العالی للقضاء والافتاء: ۱۹۹۲ء میں جب اس شعبہ کا قیام عمل میں آیا تو مفتی صاحب اس کے صدر منتخب ہوئے، اور تاحیات اس عہدہ پر رہے۔

قاضی: جب دارالقضاء شہر سے ندوہ منتقل ہوا تو آپ قاضی (رکن قاضی کونسل) مقرر ہوئے، آپ نے متعدد مقدمات کا فیصلہ کیا۔

نگراں: ایک طویل عرصہ تک دارالاقامہ شبلی کے نگراں رہے۔

ناظر مطبخ: ایک عرصہ تک مطبخ کے ذمہ دار رہے۔

ناظر شعبہ تعمیر وترقی: ایک طویل عرصہ تک شعبہ تعمیر وترقی کے ذمہ دار رہے۔

نائب ناظم: ۲۰۱۱ء سے تاحیات اس عہدہ پر فائز رہے۔

ایوارڈ:

ابنائے قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی تدریسی ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے۔

انتقال:

۲۵ ستمبر ۲۰۱۶ء کی صبح زندگی کی آخری سانس لی۔

حضرت مفتی صاحبؒ: کتاب زندگی کے چند ورق

منور سلطان ندوی

(رفیق علمی دارالافتاء، دارالعلوم ندوۃ العلماء)

خاندانی پس منظر

اعظم گڑھ اور اس کا قصبہ مبارک پور علم ودانش کا مرکز رہا ہے، مبارک پور سے متصل سٹھی نامی گاؤں کے ایک پٹھان خاندان میں ۱۹۲۷ء میں مفتی محمد ظہور ندوی کی پیدائش ہوئی، آپ کے والد جناب عبدالستار بن خان محمد فارسی کے اچھے عالم اور علاقہ کے زمیندار تھے، والدہ کا نام صابرہ خاتون ہے، آپ کے خاندان کی علمی وتعلیمی ذوق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا مفتی محمد سعید ندویؒ آپ کے بہنوئی تھے جو دارالعلوم کے استاذ اور مفتی ندوہ کے عہدہ پر فائز تھے، اور مفتی سعید ندوی کے نانا مولانا شبلی جیراجپوریؒ (م:۱۳۶۴ھ) جو ندوۃ العلماء میں شبلی فقیہ کے نام سے مشہور تھے، ایک نامور عالم دین تھے۔

تعلیم

مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر اور مدرسہ ریاض العلوم میں حاصل کی، اس کے بعد مبارک پور کی مشہور درسگاہ مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے درس نظامی کے مطابق شرح جامی تک کی تعلیم حاصل کی، یہاں آپ نے فارسی زبان میں مہارت حاصل کی۔

دارالعلوم کی علمی فضاء میں

مدرسہ احیاء العلوم کے بعد آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا، یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے، یہاں آپ کو چوٹی کے اساتذہ سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا، مفتی صاحب

نے اپنے ایک مضمون میں تحریر کیا کہ جب وہ دارالعلوم آئے تو یہاں کے ہر استاذ ۲۲/۷ فٹ کے تھے، یعنی ہر استاذ اپنے اپنے فن کے باکمال تھے، آپ نے ۱۹۴۷ء میں عالمیت مکمل کی، اس کے بعد تکمیل دینیات وفقہ کے شعبہ میں داخلہ لیا، اس شعبہ میں پڑھنے کے ساتھ چند گھنٹے پڑھانے کو بھی ملتے تھے۔

مفتی صاحب کی زمانہ طالب علمی کے بارے میں ڈاکٹر اکرم ندوی لکھتے ہیں:

''حالت طالب علمی میں مفتی صاحب نے کافی محنت کی تھی، ہر طرح کے تفریحی امور سے آنکھیں بند کرکے تحصیل علم پر پوری توجہ مرکوز کردی تھی، کتابوں کو سمجھ کر پڑھنے، مطالب کو ذہن نشیں کرنے اور علمی مسائل پر غور وخوض کرنے کے عادی تھے، اور ''شوق تو راہ می برد، درد تو زادی دہد'' پر عمل پیرا تھا'' (تعمیر حیات خصوصی شمارہ)

اساتذہ کرام

آپ نے دارالعلوم میں مولانا مصطفیٰ بستویؒ سے ریاض الصالحین، مولانا ابوالعرفان خان ندوی سے منطق کی شرح تہذیب، مولانا محمد ناظم ندویؒ سے ادب عربی وانشاء، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے مختارات، علوم قرآن، اور تفسیر، مولانا مفتی سعید ندویؒ سے ہدایہ، مولانا اسحق سندیلویؒ سے مشکوۃ المصابیح اور سنن ابوداؤد، مولانا سعید احمدؒ سے سنن ترمذی، اور مولانا شاہ حلیم عطا صاحبؒ سے صحیح بخاری وصحیح مسلم اور حجۃ اللہ البالغہ پڑھی۔

آپ نے مولانا مفتی سعید ندویؒ سے فتوی نویسی کی خاص تربیت حاصل کی، مفتی سعید صاحب دارالافتاء کے مفتی ندوہ تھے، چنانچہ وہ مفتی صاحب سے مسائل کی تحقیق کرواتے اور اخیر تکمیل کے سال فتاوی بھی لکھواتے تھے۔

دارالعلوم میں تدریس

تعلیم کی تکمیل کے بعد مفتی صاحب کو مادر علمی میں خدمت کا موقع ملا اور آپ

یہاں کے استاذ مقرر ہوئے، آپ نے ابتدائی درجات سے لے کر منتہی درجات کی کتابیں پڑھائی، آپ کے متعدد تلامذہ نے ہدایہ، سراجی، طحاوی آپ سے پڑھنے کا ذکر کیا ہے۔

مفتی صاحب کے درس کا انداز قدیم اساتذہ کا ساتھا، آپ طول طویل تقریر کے قائل نہ تھے، اختصار کے ساتھ کتاب کے مباحث کی وضاحت کرتے، آپ کے درس کی خاص بات یہ تھی کہ درس شروع ہونے سے قبل اپنے خاص انداز میں درس کا ماحول بناتے، مشکل ترین مسائل کو آسان بنا کر پیش کرتے، اس طرح طلبہ میں فن کا ذوق پیدا ہوتا، مفتی صاحب کے ابتدائی دور کے ایک شاگرد لکھتے ہیں:

ہمارے کلاس میں حضرت مفتی صاحب مسکراتے ہوئے آتے پھر سلام کرتے اور نئے سبق کے لئے ماحول بناتے، یعنی درس کی ابتداء کے طور پر ہم سب سے کچھ ایسی باتیں کرتیں جن سے خود بخود نئے سبق کا خلاصہ ہمارے سامنے آجاتا، اس تمہید کے بعد درس شروع ہوتا جسے ہم لوگ بہت آسانی سے سمجھ لیتے، حضرت مفتی صاحب کتابوں کی عبارتوں کا لفظ بلفظ اردو ترجمہ نہیں کرتے، اور نہ اپنے تلامذہ سے کرواتے تھے بلکہ پورے سبق کی اس طرح وضاحت کرتے کہ ساری چیزیں سمجھ میں آجاتی تھیں اور اشکالات بھی نہیں باقی رہتے تھے“

راقم سطور کو بھی مفتی صاحب سے پڑھنے کی سعادت ملی، راقم نے اپنے ایک مضمون میں مفتی صاحب کی تدریس کا جو طریقہ تحریر کیا ہے اسے یہاں نقل کرنا مناسب ہوگا:

”......ہدایہ جلد سوم میں کتاب البیوع اور شفعہ کی دقیق بحثیں اور حضرت مفتی صاحبؒ کا انداز تدریس، وہ منظر آج بھی نگاہوں میں ہے، مفتی صاحب درس میں طول طویل تقریر کے قائل نہ تھے، مسئلہ کی وضاحت بڑے اختصار کے ساتھ فرماتے، نپا تلا انداز، جیسے الفاظ کو تول تول کر خرچ کر رہے ہوں، لیکن یہ اختصار فہم میں مانع نہیں ہوتا، دلائل میں نقلی دلائل کے ساتھ عقلی دلائل پر بڑا زور ہوتا، اور عقلی دلائل کو خاص طور پر ذہن

نشیں کرانے کی کوشش کرتے، درس میں اصل مزا تب آتا جب کوئی طالب علم کسی مسئلہ پر اعتراض کر دیتا، خصوصا دوسرے مسالک کی دلیل پیش کر کے فقہ حنفی کے مسلک کو مرجوح ثابت کرنے کی کوشش کرتا، ایسے وقت حضرۃ الاستاذ کی حاضر جوابی، منطقیانہ استدلال اور احناف کے دلائل کی ترجیح پر مشتمل تقریر سننے کے قابل ہوتی، کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ کئی طلبہ ایک ساتھ مفتی صاحب کے ساتھ معرکہ زن ہوجاتے، لیکن مفتی صاحب اپنے طرز استدلال اور مسکت جوابات سے ہمیشہ سب کو خاموش بلکہ مات دیا کرتے تھے، طلبہ کے اعتراضات کا جواب دینے اور انہیں لاجواب کر دینے کے بعد مفتی صاحب اپنے خاص انداز میں جب مسکراتے تو پورا درجہ زعفران زار بن جاتا۔

حضرت مفتی صاحب کی تدریس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ طلبہ کو کسی بھی مسئلہ پر اظہار خیال بلکہ بحث تک کرنے کی پوری آزادی تھی، آپ اس مزاج کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ طلبہ شوخ ہوجاتے اور کبھی کبھی اعتراض کا انداز جارحانہ بھی ہوجاتا، لیکن استاذ محترم کے تحمل کا یہ حال تھا کہ کبھی برہم تو کجا چہرہ پر ناگواری کا تاثر بھی نہیں آنے دیتے، اور جب تک طلبہ کو مطمئن نہ کر لیتے سبق آگے نہیں بڑھتا، اس انداز کا فائدہ ہم طلبہ خوب اٹھاتے، اور جس دن پڑھنے کی طبیعت نہ ہوا اس دن پہلے سے آپس میں طے کر لیتے کہ آج خوب سوالات کرنے ہیں، اس طرح درجہ کا پورا وقت بحث ومباحثہ میں گزر جاتا، لیکن بحث ومباحثہ کی یہ مجلسیں سبق سے کم مفید نہیں ہوتی تھیں۔“ (تعمیر حیات، خصوصی شمارہ)

فتوی نویسی کی خدمت

مفتی سعید ندویؒ آپ کے استاذ تھے اور مربی بھی، انہی سے آپ کے اندر فقہی ذوق پیدا ہوا، اور پھر انہی سے آپ نے فتوی نویسی کی تربیت لی، ۱۹۵۰ء میں جب مادر علمی میں تقرری ہوئی تو تدریس کے ساتھ فتوی نویسی کی خدمت بھی انجام دینے

لگے، اور پھر مفتی سعید صاحب کے انتقال کے بعد ۱۹۵۵ء میں آپ باضابطہ دارالافتاء کے
ذمہ دار (مفتی ندوہ) مقرر ہوئے، اس وقت سے لے کر اخیر زمانہ تک فتوی نویسی کا سلسلہ
جاری رہا، اس طویل مدت میں بلامبالغہ ہزاروں فتاوی آپ نے تحریر فرمائے۔

آپؒ کے فتاوی کی خصوصیات

حضرت مفتی صاحب کا کمال یہ تھا کہ آپ ہر وقت اور ہر جگہ فتوی تحریر فرمادیتے
تھے، آپ سے فتوی لینا انتہائی آسان تھا، وقت کی کوئی تحدید نہ تھی، دوپہر بعد آرام کا وقت
ہو یا رات ہو، بلکہ راستہ چلتے بھی کوئی استفتاء آپ کے سامنے پیش کرتا تو آپ بلا تکلف
فتوی تحریر فرمادیا کرتے تھے، مسائل کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ سوال کی نوعیت جو بھی
ہو آپ اسی وقت جواب تحریر فرمادیتے۔

مفتی صاحب کے فتاوی میں فنی لحاظ سے جو خاص بات نظر آتی ہے وہ ہے اختصار،
یعنی بالکل نپے تلے الفاظ جیسے قانون کے ہوتے ہیں، زبان کی سادگی کہ کوئی عام آدمی بھی
سمجھ لے، فقہی اصطلاحات اور دقیق اسلوب سے پرہیز، مستفتی کے حالات کی رعایت،
حتی الامکان جمہور کی رائے کو اختیار کرنا، سوال اور سائل کے مقصد کو فورا بھانپ لینا
اور معاملہ کہ تہہ تک پہونچ جانا اور مستفتی کی باتوں سے متاثر نہ ہونا، اور ان سب کے ساتھ
تقوی اور خوف خدا کی صفت، یہ سب آپ کے فتاوی کے امتیازات ہیں۔

نائب مہتمم اور عمید کلیۃ الشریعہ

مفتی صاحب علمی وفقہی مہارت کے ساتھ انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے،
چنانچہ دارالعلوم میں تدریس کے ساتھ انتظامی امور کو انجام دیتے تھے، آپ کی انتظامی
صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو انتظامی ذمہ داریاں بھی ملیں، دارالعلوم کے مہتمم مولانا محبّ
اللہ لاری ندویؒ آپ کی ان صلاحیتوں کے بڑے قائل تھے، ان ہی کے دور اہتمام میں
آپ نائب مہتمم بنائے گئے، یہ شاید ۱۹۸۰ء کی بات ہے، آپ طویل زمانہ تک اس عہد

پر رہے، خود مولانا لاری کے اخیر دور میں آپ قائم مقام مہتمم بھی رہے، اس کے بعد
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے دور میں
۲۰۱۰ء تک آپ اسی عہدہ پر رہے۔

مفتی صاحب کے دور میں مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ کلیۃ الشریعہ کے عمید
تھے، ۱۷/ نومبر ۱۹۸۸ء کو آپ کے انتقال کے بعد مفتی صاحبؒ عمید کلیۃ الشریعہ بنائے
گئے، اور نائب ناظم ندوۃ کے عہد پر فائز ہونے تک یہ عہدہ باقی رہا۔

المعہد العالی للقضاوالافتاء کی صدارت

۱۹۸۶ء میں مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی کوششوں سے لکھنؤ میں دارالقضاء
کا قیام میں عمل آیا، ابتداء دارالقضاء کا دفتر شہر میں قائم ہوا، پھر چند سالوں بعد ۱۹۹۲ء میں
دارالقضاء دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احاطہ میں منتقل ہوا، اس موقع پر دارالقضاء
اور دارالافتاء کے لئے ایک مستقل عمارت تعمیر ہوئی، نیز ان شعبوں کے لئے المعہد العالی
للقضاء والافتاء کا شعبہ قائم ہوا، مولانا سید سلمان حسینی ندوی اس شعبہ کے سکریٹری اور
حضرت مفتی صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے، مفتی صاحبؒ تاحیات اس شعبہ کے ذمہ
دار رہے، اور آپ کی نگرانی میں اس کی سرگرمیاں جاری رہیں۔

مفتی صاحبؒ: بحیثیت قاضی

اسی موقع پر دارالقضاء میں قضاء سے متعلق امور کے لئے قاضی کونسل بنایا گیا،
جس کے صدر مولانا برہان الدین سنبھلی صاحب مقرر ہوئے اور اس کونسل میں کار قضاء
کے جن حضرات کو متعین کیا گیا ان میں ایک نام حضرت مفتی صاحبؒ کا بھی ہے، مفتی
صاحبؒ نے قضاء کی ذمہ داری بھی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، آپ نے متعدد
مقدمات کا فیصلہ فرمایا۔

اللہ تعالی نے آپ کو معاملہ فہمی کا اچھا ذوق عطا فرمایا تھا، جس کی جھلک آپ کے

فیصلوں میں صاف نظر آتی ہے،فریقین کی باتوں کوسن کو بہت جلد معاملہ کی تہہ تک پہونچ
جاتے اور صحیح نتائج اخذ کرتے ، فیصلہ کرنے میں پوری دیانت داری،حزم واحتیاط کوملحوظ
رکھتے،فریقین کو باتوں سے اختلاف کی حقیقت تک پہونچنااوران کی جذباتیت سے
متاثر نہ ہونا قاضی کا بڑا کمال ہوتا ہے، یہ صفت آپ میں بدرجہ اتم موجود تھی،آپ کے
فیصلے عموماً مختصر ہوتے تھے،آپ کے متعدد فیصلے دارالقضاء کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں، اخیر
زمانہ میں مقدمات کے لئے قاضی کی تعیین کا عمل بھی آپ کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔

الفلاح میچول بینیفٹس کے شرعی مشیر

چندسالوں قبل ہندوستان میں اسلامی مالیاتی اداروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا، اسی
دور میں ۱۹۸۰ء کے دہائی میں الفلاح میچول بینیفٹس کے نام سے لکھنؤ میں ایک مالیاتی
ادارہ لکھنؤ میں وجود میں آیا، جس کے بانی مشہور شخصیت جناب سید صدیق حسن کے فرزند
جناب رشید سید احمد(وفات: ۲۰۱۰ء) تھے، رشید صاحب بڑا دینی جذبہ رکھتے تھے، انہوں
نے اس ادارہ کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا تھا، چنانچہ انہوں نے شرعی رہنمائی کے لئے
حضرت مفتی صاحبؒ اور مولانا برہان الدین صاحب کو بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شامل کیا،
یہ دونوں حضرات شرعی مشیر کی حیثیت سے اس میں شریک رہے، اور جب تک بینک کی
سرگرمیاں جاری رہیں آپ اس کی میٹنگوں میں شریک ہوتے رہے، اور شرعی رہنمائی
انجام دتے رہے، بینک کی سرگرمیوں میں ان حضرات کی رہنمائی سے کتنا فائدہ اٹھایا گیا،
اس بارے میں کوئی یقینی بات کہنا مشکل ہے، البتہ جب چند سالوں بعد ہی بینک کا زوال
ہوا، اور نتیجتاً بینک کے بانی کے ساتھ مصائب کا سلسلہ شروع ہوا، تو ایسے موقع پر حضرت
مفتی صاحب کی بے مثال استقامت سامنے آئی، آپ نے رشید صاحب کی مکمل معاونت
کی، جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو رشید صاحب کو اپنے گھر میں پناہ دی، اور مستقل
ان کی پشت پناہی کرتے رہے، اس نازک صورت حال میں مفتی صاحب مرحوم تنہا ان

کے ساتھ کھڑے رہے، اور کبھی پائے استقامت میں تزلزل نہیں آیا۔

مذاکرہ علمی کی مجالس میں مفتی صاحبؒ کی شرکت

کلیۃ الشریعہ کے اہتمام مختلف علمی موضوعات پر ماہانہ مجلس مذاکرہ کا انعقاد ہوتا
تھا، جس میں اساتذہ اور بسا اوقات فن کے ماہرین شریک ہوتے تھے، راقم سطور کے
زمانۂ طالب علمی تک یہ سلسلہ جاری تھا، اس دور میں اس طرح کے متعدد پروگرام ہوئے،
ایک مجلس طلاق سکران پر منعقد ہوئی، ایک مجلس کا موضوع رویت ہلال تھا، جس میں
برطانیہ کے مفتی یعقوب صاحب شریک تھے، ان مجلسوں میں حضرت مفتی صاحب شریک
ہوئے اور مباحثہ میں حصہ لیتے تھے۔

استاذ محترم مولانا سلمان حسینی ندوی نے اپنی ڈائری میں اس طرح کی ایک مجلس کا
ذکر کیا ہے جس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ہدایہ اور صاحب کے موضوع پر مقالہ پیش
کیا جسے بہت پسند کیا گیا، اور صدر جلسہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بھی
بھی اس مقالہ کی تحسین کی۔(مذکراتی، ج۱۵، ص:۶۵)

تربیتی سیمیناروں میں شرکت اور صدارت

یاد ش بخیر چند سالوں قبل جب ندوۃ العلماء سے ملحق مدارس کے اساتذہ کی علمی
وفکری تربیت کے لئے تربیتی سیمیناروں کا سلسلہ شروع ہوا، تو تفسیر، فقہ اور فتوی نویسی جیسے
موضوعات پر متعدد سیمینار منعقد ہوئے، ان سیمیناروں میں مفتی صاحبؒ شریک ہوئے،
مختلف نشستوں کی آپ نے صدارت بھی کی، ہم چھوٹوں کے اصرار پر فتوی نویسی کے
موضوع پر اپنا مختصر مقالہ بھی پڑھا جو آپ کے وسیع تجربات کا حاصل تھا، اور علمی رنگ میں
تھا، کوشش کے بعد بھی یہ مقالہ دستیاب نہ ہوسکا۔

مولانا عبدالعلی تدریسی ایوارڈ

تنظیم ابناء قدیم کے نام سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فضلاء کی ایک تنظیم ہے

جس کے روح رواں سعید الرحمٰن فیضی اور دیگر ندوی فضلاء ہیں، اس تنظیم کے ذمہ داروں نے اپنے اساتذہ کی خدمات کے اعتراف کا ارادہ کیا، چنانچہ ان حضرات نے دارالعلوم کے موجودہ پانچ بزرگ اساتذہ کو تدریسی خدمات ایوارڈ پیش کرنے کا فیصلہ کیا، دسمبر ۲۰۱۲ء میں اس تنظیم کے زیر اہتمام دوروزہ اجلاس جامعہ سید احمد شہید ملیح آباد میں منعقد ہوا، اس اجلاس کی صدارت علامہ سید سلیمان ندوی کے فرزند ارجمند ڈاکٹر سلمان ندوی نے کی، اوران کے ہاتھوں ان اساتذہ کی خدمت میں ایوارڈ پیش کیا، اس موقع پر جن پانچ اساتذہ کو ایوارڈ دیا گیا ان کے اسماء اس طرح ہیں: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا محمد برہان الدین سنبھلی دامت برکاتہم اور مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، حضرت مفتی صاحب کو جو ایوارڈ پیش کیا گیا وہ مولانا عبد العلی حسنی کے نام نامی سے موسوم ''مولانا عبد العلی تدریسی ایوارڈ'' تھا، یہ ایوارڈ ایک معقول رقم اور توصیفی سند پر مشتمل تھا، اس موقع پر مذکورہ تمام حضرات کی خدمت میں سپاس نامے بھی پیش کئے گئے، بحمد اللہ مفتی صاحب کے سپاس نامہ کو لکھنے اور پڑھنے کی سعادت راقم کے حصہ میں آئی۔

نائب ناظم کے لئے آپ کا انتخاب

۱۴ ستمبر ۲۰۱۰ء کو پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب کا انتقال ہوا، آپ معتمد مال کے ساتھ نائب ناظم بھی تھے، چنانچہ پروفیسر صاحبؒ کی جگہ حضرت مفتی صاحب کا بحیثیت نائب ناظم انتخاب ہوا، یہ ندوۃ العلماء کی جانب سے مفتی صاحب کی خدمات کا سب سے بڑا اعتراف تھا۔

فتاوی ندوۃ العلماء کی نظر ثانی

۲۰۰۵ء میں راقم سطور کو دارالافتاء سے صادر ہونے والے فتاوی کی ترتیب وتحقیق کی ذمہ داری ملی، بحیثیت صدر شعبہ یہ کام آپ کی نگرانی میں ہوا، فتاوی کی ترتیب وتحقیق کا

خاکہ آپ کے مشورہ سے بنایا گیا، اور آپ کی نگرانی میں یہ کام آگے بڑھتا رہا، جب ایک جلد کا کام مکمل ہوا تو یہ طے پایا کہ پوری جلد کے فتاوی کو حضرت مفتی صاحب کی نظر سے گزارا جائے، اور آپ کی نظر ثانی کے بعد ہی اس کی اشاعت ہو، یہ مرحلہ بہت مشکل تھا، ایک تو حضرت مفتی صاحب کی نوع بہ نوع مصروفیات اور دوسری نظر ثانی کی دقت انگیزی، لیکن اللہ کے فضل وکرم سے یہ کام بھی مکمل ہوا، شکل یہ بنی کہ راقم حضرت مفتی صاحبؒ کو روزانہ کچھ صفحات سنائے، اور مفتی صاحب جہاں ضرورت محسوس کریں ترمیم واضافہ کریں، اس طرح ہر ہر فتوی آپ کی نظر سے گزرا، اور آپ نے جہاں ترمیم واضافہ کی ضرورت محسوس کی ترمیم واضافہ کیا، ندوۃ العلماء کے دارالافتاء سے صادر ہونے والے فتاوی کی نظر ثانی اس لئے زیادہ مشکل تھی کہ یہ فتاوی مختلف مفتیان کرام کے قلم سے لکھے گئے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ہر مفتی کا انداز الگ ہوتا ہے، اس طرح ایک موضوع پر متعدد فتاوی جمع تھے، جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے تھے، حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی فقہی بصیرت کی روشنی میں حسب ضرورت ان فتاوی میں اس طرح ترمیم واضافہ کرایا کہ مختلف فتاوی میں یکسانیت ہوگئی۔

نظر ثانی کے اس مرحلہ میں حضرت مفتی صاحبؒ نفس فتاوی کے ساتھ ان فتاوی سے متعلق حواشی جو دلائل پر مشتمل ہوتے، انہیں بھی بنظر غائر دیکھتے، ابتداء میں راقم نے متعدد فتاوی پر حواشی لکھا تھا، بعض حواشی مسئلہ کسی شق کی وضاحت سے متعلق تھے، بعض مسائل میں دیگر مسالک کی آراء کو نقل کیا تھا، اسی طرح بعض جدید مسائل میں معاصر فقہاء کی آراء کو نقل کیا تھا، حضرت مفتی صاحب نے ان حواشی کو دیکھنے کے بعد فرمایا کہ الگ سے ان حواشی کی ضرورت نہیں ہے، پھر آپ نے فتاوی کی عبارت میں ایسی ترمیم کرائی کہ حواشی کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس بارے میں مفتی صاحب کی رائے یہ تھی کہ متن کے خلاف حاشیہ میں کوئی بات نہیں ہونی چاہیے، خواہ وہ جدید مسائل میں معاصر علماء کی رائے ہی کیوں

نہ ہو،مفتی صاحب فرماتے کہ اس طرح قارئین متن اور حاشیہ میں تضاد محسوس کریں گے۔

اس طرح آپ کی نگرانی میں فتاوی کی تین جلدیں تیار ہوئیں،اور آپ کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئیں۔

فقہی مقالات ومحاضرات

علمی کاموں میں فتاوی نویسی اور تدریس آپ کے فطری ذوق کے مطابق تھی،اس کے علاوہ کسی اور علمی مصروفیت کی جانب طبیعت زیادہ مائل تھی،اس لئے آپ نے ادھر توجہ بھی نہیں کی،لیکن اس کے باوجود چند مواقع ایسے بھی آئے جب بڑوں کے کہنے یا بعض خوردوں کے اصرار پر آپ نے علمی مجالس میں شرکت کی،اور اپنی گفتگو اور تحریر سے یہ تاثر دیا کہ وہ ان میدانوں سے اتنا بیگانہ بھی نہیں ہیں جتنا سمجھا جاتا ہے۔

دارالعلوم میں منعقدہ ایک مذاکرہ علمی میں مفتی صاحب نے ’ہدایہ اور صاحب ‘ کے موضوع پر مقالہ پیش کیا تھا۔

ابناء قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی جانب سے دارالعلوم کے پانچ اساتذہ کو ایوارڈ دینے کی تقریب عمل میں آئی تو مولانا سلمان حسینی ندوی صاحب نے ان پانچوں اساتذہ سے مقالہ لکھنے کی درخواست کی،آپ کے اصرار پر مفتی صاحب نے دارالافتاء کی تاریخ اور فتاوی ندوۃ العلماء کی خصوصیت پر مقالہ لکھا،جسے پیش کرنے کی سعادت راقم سطور کو حاصل ہوئی،یہ مقالہ بھی بڑی توجہ اور شوق سے سنا گیا۔

مفتی صاحب کے شاگرد اور سابق استاذ حدیث مولانا محمد ناصر علی ندویؒ کا جب انتقال ہوا تو اس موقع پر ہم لوگوں نے مفتی صاحب سے تاثراتی مضمون لکھنے کی درخواست کی،آپ نے راقم کو ہی یہ مضمون املا کرایا،اسی طرح مولانا محبوب الرحمٰن ازہری صاحبؒ کے انتقال پر آپ نے مضمون املا کرایا،ان دونوں مواقع پر راقم نے بعض محاوروں پر توجہ دلائی تو آپ نے بڑے اطمینان سے کہا کہ اب آپ لوگ کیا جانیں گے،

آزادی کے وقت یہی زبان استعمال ہوتی تھی،پرانے لوگ ان محاوروں کا لطف لے سکیں گے،آپ کی یہ تحریریں دونوں شخصیات سے متعلق مجموعہ مقالات میں شامل ہیں۔

خطابت

خطابت آپ کا میدان نہیں تھا،البتہ اپنی بات کہنے کا سلیقہ سے کہنے کا ہنر آپ جانتے تھے،چنانچہ لوگوں کے اصرار پر دینی جلسوں کی صدارت بھی قبول کرتے اسی طرح طلبہ کے پروگرموں میں بھی شریک ہوتے اور ہر جگہ مختصر گفتگو فرماتے تھے۔

دارالعلوم میں سال کے شروع میں طلبہ کے لئے تربیتی پروگرام ہوتا ہے اس میں سینئر اساتذہ کا خطاب ہوتا ہے،اسی طرح کا ایک پروگرام تھا جب اچانک اعلان ہوا کہ آج مفتی صاحبؒ خطاب فرمائیں گے،چنانچہ مفتی صاحب مائک پر آئے اور اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا کہ آج میری تقریر کا عنوان ہے’’بلا عنوان‘‘ اتنا سنتے ہی تمام طلبہ ہنسنے لگے،اس کے بعد مفتی صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں مختصر گفتگو کی۔

شعروادب کاذوق

مفتی صاحب کو جاننے والے جانتے ہیں کہ مفتی صاحب اصولی آدمی تھے،فقہ وافتاء سے تعلق اس پر مستزاد،حالانکہ فقہ وافتاء سے تعلق ادبی ذوق سے بے بہرہ ہونے کی علامت نہیں ہے،اور نہ ہی اس فن سے وابستگی ادبی ذوق کے لئے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی ہے،متعدد ایسے فقہاء گزرے ہیں جن کا ادبی پایہ بلند تھا،معاصر فقہاء میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں،بہرحال مفتی صاحب کی سادگی کے پردوں میں مفتی صاحب کا ادبی ذوق بھی پوری طرح چھپ کر رہ گیا،آپ کا ادبی ذوق اس وقت نکھر کر سامنے آتا جب کسی مجلس میں آپ کھلتے،بے تکلف شاگردوں کے درمیان آپ نے نہ صرف اشعار سنائے بلکہ جگر اور دیگر بلند پایہ شعراء کی غزلیں بھی سنائیں،شعر فہمی کا ذوق بھی تھا،آپ پسندیدہ اشعار سنانے کے بعد ان میں جو الفاظ یا تعبیر پسند آئی اس کو بھی بیان کرتے تھے،آپ کو علامہ سید سلیمان ندویؒ کی عارفانہ غزل بہت پسند تھی،سید صاحبؒ کے یہ اشعار کثرت

سے پڑھا کرتے تھے:

اف ری دریائے معاصی کی تلاطم خیزی
وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں
ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسم گل میں توبہ
جو نہ ٹوٹے میرے غفار کہاں سے لاؤں
توبہ ،توبہ میری توبہ بھی ہے کوئی توبہ
ٹوٹ جائے جو نہ ہر بار کہاں سے لاؤں

اسی طرح ایسے اشعار کثرت سے پڑھتے جن میں توبہ اور گناہوں کے کفارہ کا ذکر ہوتا،راقم نے اسی طرح ایک مجلس میں مفتی صاحب سے دریافت کہ آپ نے کن شعراء کو دیکھا،تو مفتی صاحبؒ نے جگر مرادآبادی کے علاوہ کئی شعراء کو دیکھنے اوران سے سننے کا تذکرہ کیا،افسوس یہ باتیں اس وقت قلمبند نہ سکا،ورنہ اس موضوع پر اچھا مواد جمع ہوجاتا۔

انتظامی صلاحیت

استاذ محترم مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ کو اللہ تعالی نے جن صلاحیتوں سے نوازا تھا ان میں ایک اہم وصف انتظامی صلاحیت ہے،دارالعلوم میں تدریسی اور افتاء نویسی کے علاوہ جو ذمہ داریاں انجام دیں ان سب کا تعلق انتظام وانصرام سے ہے، انتظامی امور کی خداداد صلاحیت آپ کے اندر تھی،انتظامی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لئے جس معاملہ فہمی،تفہیم ،اقدام ،قوت فیصلہ،صبر وبرداشت ،اور مواجہت کی ضرورت پڑتی ہے وہ تمام صلاحیتیں آپ کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں،آپ کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل ہوجاتا ہے کہ آپ کے اندر علمی وتدریسی صلاحیت زیادہ تھی یا انتظامی صلاحیت، بہر حال یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ کے اندر دونوں طرح کی صلاحتیں جمع تھیں،اور شاید انتظامی ذوق آپ کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھا جس کی وجہ سے آپ نے علمی وتصنیفی کاموں کو اپنا میدان نہیں بنایا۔

دارالعلوم میں تدریس کے آغاز سے ہی آپ انتظامی کاموں میں مصروف کار نظر آتے ہیں،مدرس بننے کے بعد ہی آپ نے مطبخ کی ذمہ داری سنبھالی،ایک عرصہ تک شبلی ہاسٹل کے اتالیق ومربی (یہاں کی اصطلاح میں نگراں) رہے،دارالاقامہ کے مسائل کچھ کم نہیں ہوتے ہیں،پھر طلبہ کے آپسی معاملات کو سلجھانا،ان کی دینی تربیت کی فکر کرنا،اس طرح کے بہت سے کام انجام دینے پڑتے ہیں،مفتی صاحبؒ بحسن وخوبی ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوئے،آپ ایک طویل عرصہ تک نائب مہتمم رہے،مولانا محبّ اللہ لاری ندویؒ کے دور اہتمام میں آپ نائب مہتمم بنائے گئے،حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کے دور اہتمام آپ اسی عہدہ پر رہے،اوراس کے بعد مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کے دور اہتمام میں بھی آپ نائب رہے،ان تینوں شخصیات کے ساتھ مل کر آپ نے کام کیا اور ہمیشہ ان حضرات کے دست وبازو بنتے رہے،اس مناسبت سے حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب ہوگا،آپ تحریر فرماتے ہیں:

’’مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے ان کا بہت تعلق تھا،جب وہ مہتمم دارالعلوم ہوئے اس وقت مفتی صاحب مرحوم نائب مہتمم تھے،اور پہلے سے بھی اس اعتبار سے مفتی صاحب منصب میں ان سے اونچے تھے،لیکن ان کے مہتمم ہونے پر انہوں نے اپنے کو ان کا ایسا تابع بنالیا جیسے پہلے وہ اونچے منصب پر نہ رہے ہوں،اور بعد میں بھی،اوراس سے پہلے بھی اس بات کا لحاظ رہا تھا کہ ان کے مشوروں اور ایماء کو ترجیح دی کر فیصلہ لیتے اور دارالعلوم کے مفاد میں جو کام ہوتا اس کو پوری تن دہی سے انجام دیتے،اور کسی ناراضگی وغیرہ کی پرواہ نہ کرتے،وہ اپنی رائے میں صلابت رکھتے تھے،اور دارالعلوم اور ندوۃ العلماء کے مفاد کو اور شریعت کے حدود کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقدام کرتے۔(تعمیر حیات،خصوصی شمارہ)

اسی طرح شعبۂ تعمیر وترقی کے ذمہ دار کی حیثیت سے آپ نے عرصہ تک خدمت انجام دی،آپ کی نگرانی میں متعدد عمارتوں کی تعمیر ہوئی۔

سادگی اور تواضع

سادگی اور تواضع مفتی صاحبؒ کی سب سے بڑی پہچان تھی، اہم عہدے اور مناصب کے ساتھ اتنی سادگی کی مثال تاریخ میں کم ملے گی، تواضع سے متعلق متعدد واقعات زبان زدعام وخاص ہے، تواضع کا یہ حال تھا کہ مفتی صاحبؒ بیک وقت کئی شعبوں کے ذمہ دار رہے، لیکن کسی بھی آفس میں بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے، کہیں بھی بیٹھ جاتے اور سارے کام وہیں انجام دیدیتے۔

زہدوتقوی

مفتی صاحبؒ ندوہ میں بڑے عہدوں پر رہے، لیکن جاہ ومنصب کا کوئی اثر انہیں زندگی میں کبھی دیکھا نہیں گیا، اساتذہ اور طلبہ بلکہ دارالعلوم کے ملازمین بھی بے تکلفی کے ساتھ آپ سے بات کر لیتے، آپ کو کہیں بھی بیٹھنے میں کوئی عار نہیں ہوتا سائیکل کے پیچھے بیٹھ کر شہر چلے جاتے، خودنمائی تو ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی، نمایاں ہونا گویا جانتے ہی نہ تھے، آخرت کا بڑا استحضا تھا، ہمیشہ موت کو یاد کرتے تھے، اخیر عمر میں جب نشاط میں ہوتے تو علامہ سید سلیمان ندوی کی عارفانہ غزل گنگنایا کرتے تھے، خاموشی سے لوگوں کی مدد کیا کرتے تھے، آپ کی پوری زندگی قناعت اور کفایت شعاری کی مثال ہے، مفتی صاحبؒ خود سنایا کرتے کہ جب دارالعلوم سے تنخواہ ملتی ہے تو وہ پوری اہلیہ کے ہاتھ پر رکھ دیتے اور اپنے جیب خرچ کے لئے کچھ روپے لے لیتے، آپ نے ایک مرتبہ بیان کیا کہ ان کی اہلیہ نے کسی موقع پر مفتی صاحب سے کہا کہ آپ نے اب تک اپنا گھر بنانے کے بارے میں نہیں سوچا، مفتی صاحب نے جواب دیا کہ پوری تنخواہ آپ کو دے دیتا ہوں، اب آپ کا کام ہے کہ گھر بنانے کے سوچیں یا مہینہ کا خرچ چلائیں۔

صبرواستقامت

آپ کا ایک نمایاں وصف صبرواستقامت ہے، آپ مختلف حوادث سے

دوچار ہوئے، آزمائشوں سے گزرے، لیکن صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا، اس حوالہ سے مولانا علاء الدین ندوی صاحب کا ایک اقتباس نقل کرنا مناسب ہوگا، آپ تحریر کرتے ہیں:

''واقف کار جانتے ہیں کہ وہ اپنے گھریلو زندگی میں بعض روح فرسا اور ہمت شکن حالات سے دوچار ہوئے، مگر ہمت کے دھنی اور اعصاب کے اتنے مضبوط تھے کہ کبھی انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ غم ومصیبت کا کوئی پہاڑ ان پر گرا ہے، وہ غم حیات کے زہر کو تقدیر کا تریاق سمجھ کر پی لینے کے ایسے عادی ہوگئے تھے کہ ان کے انداز گفتگو، سماجی سلوک، اور رویہ زندگی سے کہیں بھی آلام ومحن اور کرب والم کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔''

تعلقات نبھانا

شہر کے افراد کثرت سے اپنے مسائل کو حل کرانے مفتی صاحب مرحوم کے پاس آیا کرتے تھے، اس بنیاد پر مفتی صاحبؒ کے شہر میں بڑے تعلقات تھے، آپ کے جاننے والے آپ کی بڑی قدر کرتے تھے، آپ بھی ان لوگوں کا خیال رکھتے تھے، اور جو جہاں آپ کو بلاتے آپ ضرور تشریف لے جاتے، اپنے تعلق والوں میں کوئی بیمار ہو ان کی عیادت کے لئے ضرور جاتے، آپ کو جب کبھی اس مہم پر جانا ہوتا تو کسی سے بھی کہتے کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے، کوئی لے چلو، اس طرح ہم لوگوں نے بارہا ایسے لوگوں کی عیادت کے لئے جاتے دیکھا جو مفتی صاحب سے بہتر حالت میں تھے، ہم لوگ عرض کرتے کہ آپ جن سے ملنے جاتے ہیں ان کو کہہ دیا کریں وہ خود آپ سے ندوہ آ کر مل لیا کریں، تو مفتی صاحب مسکراتے اور کہتے مجھے بھی تو کچھ کرنا چاہیے، جب مفتی صاحب گھٹنوں کی تکلیف کی وجہ سے معذور سے ہوگئے تب بھی کوئی اہل تعلق بلاتا تو ان کے یہاں تشریف لے جاتے، انتقال سے قبل ایک صاحب نے اپنی کلینک کے افتتاح کے لئے مفتی صاحب سے درخواست کی تو مفتی صاحب نے ان کی بات مان لی اور واقعی اس تقریب میں تشریف لے گئے، وہاں موجود افراد آپ کو دیکھ کر حیران ہوئے کیونکہ مفتی صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ آپ آج کل بیمار ہیں اور معذور ہو گئے ہیں، اس طرح تعلقات

نبھانے والی جوبات مفتی صاحب کے دیکھی اس کی مثال کم ملتی ہے۔

ذاتی زندگی میں عزیمت پر عمل

مفتی صاحبؒ خود فقہ کے شناور تھے، ہر مسئلہ میں رخصت اور عزیمت دونوں پہلوؤں سے خوب واقف تھے، شریعت میں معذور کے لئے کتنی گنجائش ہے وہ آپ کی نظر میں تھی، اس کے باوجود مفتی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی ذاتی زندگی میں ہمیشہ عزیمت کو اختیار کرتے تھے، ویل چیئر سے جماعت کے لئے مسجد جانا آپ کی مستقل عادت تھی، معذوری کے باوجود کھڑے ہوکر نماز ادا کرتے تھے، جب بہت زیادہ معذور ہوگئے تب کرسی پر نماز پڑھنے لگے، آپ کی عمر کے اساتذہ تو بس گنتی کے چند ہی تھے، اپنے چھوٹی عمر کے اساتذہ سے ملنے ان کے پاس جایا کرتے تھے، خود بیمار تھے، لیکن دوسروں بیماروں کی عیادت کو ترجیح دیتے تھے، ملنے والوں سے ان کے گھریلو حالات معلوم کرتے، اپنے متعلقین کی خبر رکھتے، اور ملنے پر اس سے متعلق پوچھتے، اس طرح کی بہت سی مثالیں مفتی صاحب کی زندگی میں ملتی ہیں۔

ایک بار مفتی صاحب زیادہ بیمار ہوئے، کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹروں نے خون چڑھانے کا مشورہ دیا، مگر آپ تیار نہیں ہوئے، اس موقع پر ہم چند رفقاء دارالافتاء مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوئے، اور جب معلوم ہوا کہ مفتی صاحبؒ خون چڑھانے سے انکار کررہے ہیں تو ہم لوگوں نے خون چڑھانے کے موضوع پر مفتی صاحب کو قائل کرنے کی بڑی کوشش کی، مگر مفتی صاحب کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے، اخیر میں ہم لوگوں نے رخصت کی بات کہی، اور اس حال میں شرعی اجازت پر عمل کرنے پر اصرار کیا، اس کے جواب میں مفتی صاحب نے ایسی بات کہی جس سے آپ کے تدین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، آپ نے کہا کہ شرعی رخصت اپنی جگہ، لیکن میں نے سنا ہے کہ خون دینے والے کے اثرات بھی خون کے ساتھ منتقل ہوتے ہیں، پھر آپ نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک متدین شخص نے خون چڑھوایا، خون کا اثر یہ ہوا کہ انتقال کے بعد اس کی زبان سے

کفریہ کلمات نکلنے لگے، اس واقعہ کی روشنی میں آپ نے اپنے لئے یہ طے کیا کہ خون کبھی نہیں چڑھائیں گے اور شاید زندگی میں کبھی اس کے لئے خود کو آمادہ نہیں کرسکے۔

مفتی صاحب صاحبؒ اخیر سالوں میں مستقل بیمار رہے، گھٹنے کی تکلیف کی وجہ سے چلنے سے معذور رہے، اور یہ معذوری چند دنوں کی نہیں تھی، مگر اس کے باوجود آپ طلبہ سے مستقل خدمت لینے کو پسند نہیں کرتے تھے، متعدد بار آپ سے کہا گیا کہ کچھ طلبہ کو آپ کی خدمت کے لئے مقرر کردیا جائے وہ آپ کے پاس رہیں گے، لیکن آپ تیار نہیں ہوئے، یہاں تک کہ دارالعلوم سے کوئی ملازم بھی لینے کے روادار نہیں ہوئے، اس موقع پر متعدد سعادت مند طلبہ نے آپ کی خدمت کی، آپ کے ساتھ لگے رہے، مگر آپ کا مزاج یہ تھا کہ طلبہ تو کیا ملازم سے بھی خدمت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

مرنجان مرنج شخصیت کے مالک

مفتی صاحب مجلسی آدمی تھے، آپ کی مجلسیں بڑی پر رونق ہوتیں، ایک زمانہ میں جب مولانا ناصر علی ندویؒ زندہ تھے، تو اکثر آپ وہاں تشریف لاتے، مولانا عارف سنبھلی ندویؒ بھی آتے اور مولانا عتیق احمد بستوی بھی، ان چاروں کی موجودگی میں مجلس کا لطف دوبالا ہوجاتا، یہاں کی مجلس میں فقہ کا رنگ غالب ہوتا، لیکن اس کے علاوہ موضوعات بھی زیر بحث آتے تھے، آپ کا کمال یہ تھا کہ آپ جہاں بیٹھ جاتے وہیں مجلس جم جاتی، پھر لطیفے، بذلہ سنجیاں، مفتی صاحب کی حاضر جوابی کے نمونے اور نہ جانے کیا کیا، اس مجلس کا حصہ بنتی تھیں، مفتی صاحب کا امتیاز یہ تھا کہ آپ کے لطیفے اور بذلہ سنجیاں کبھی تہذیب کے دامن سے باہر نہیں ہوتیں، آپ کی سادگی ضرب المثل ضرور تھی، مگر زبان میں پھکڑ پن نہیں تھا، اور نہ ہی بازاری الفاظ استعمال کرتے تھے، اس طرح مجلسیں عموماً کینٹین، ڈاکٹر ہارون رشید صاحب، دفتر مالیات میں جناب اقبال صاحب کے یہاں سجتی تھیں، ان مجلسوں میں مفتی صاحب کی حیثیت بلبل ہزار داستاں کی ہوتی تھی، یہاں مسائل بھی بیان ہوتے، مسائل پر بحث بھی ہوتی، ندوہ کا نظام بھی زیر

بحث آتا اور جزوی واقعات پر تبصرہ بھی ہوتا، مفتی جہاں کھل کر بولتے وہیں شرکاء بھی بولنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتے، البتہ گیند ہمیشہ مفتی صاحب کے پالہ میں ہوتی، مفتی صاحب حسب عادت اپنی بات پر جمے رہتے، اور کسی کے لئے انہیں قائل کرنا آسان نہیں ہوتا، اس طرح بے تکلفی کی مجلس جو بےضرر بھی ہو اور بافیض بھی، شاید مفتی صاحب کے ساتھ ختم ہوجائے گی۔

ظرافت وحاضر جوابی

ظرافت وحاضر جوابی مفتی صاحب کی شخصیت کا جزء لاینفک تھی، ان دوصفات کے بغیر آپ کی شخصیت کی تصویر نامکمل سمجھی جائے گی، آپ کی ظرافت اور حاضری جوابی کے سلسلہ کے بہت سے قصے مشہور ہیں، آپ بلا کے ذہین تھے، اور یہ ذہانت حاضر جوابی کی شکل میں ڈھل کر سامنے آتی تھی، خصوصا علمی مجالس میں آپ کی حاضر جوابی کھل سامنے آتی تھی، اسی طرح دارالعلوم سے متعلق انتظامی امور میں آپ اس صفت سے بہت سے مسائل حل کردیا کرتے تھے، آپ کی ظرافت کی جمع کیا جائے تو خاصے واقعات جمع ہوجائیں گے، ظرافت کے حوالہ یہ بات بہت اہم ہے کہ آپ کی زبان کبھی ادب کے دائرہ سے باہر نہیں جاتی، لطائف ہمیشہ سنجیدہ ہوتے، اور باتوں سے بات پیدا کر کے الفاظ کا لطف لیتے تھے۔

ذمہ داران ندوہ سے تعلق اور ان کا اعتماد

مفتی صاحبؒ ہمیشہ دارالعلوم کے ذمہ داران سے قریب رہے، اس قربت کی وجہ جہاں مفتی صاحبؒ کی انتظامی صلاحیت تھی وہیں ذمہ داران کا اعتماد بھی تھا، آپ کو مولانا محبّ اللہ لاری ندویؒ، مولانا معین اللہ ندویؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، ان تمام ذمہ دران کے ساتھ آپ کے مخلصانہ اور محبانہ روابط رہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی

ندوی اور مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن ندوی نے اپنے تاثرات میں جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اس سے ان حضرات کے درمیان باہمی ربط وتعلق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری مفتی صاحبؒ کے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے تعلق کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

’’حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے پاس اس زمانہ میں جتنے مسائل آتے تھے، حضرت تمام سوالات کے جوابات کے لئے مفتی صاحبؒ کی طرف محول کراتے تھے، اور ان کی علمی صلاحیت پر پورا اعتماد تھا، اگرچہ مفتی صاحب اپنے مشاغل کی وجہ سے حضرت کی خدمت میں بہت کم حاضری دیتے تھے، لیکن جب حاضر ہوتے تو حضرت مولاناؒ بہت خیال فرماتے، اور کبھی کبھی کوئی مسئلہ بھی پوچھتے، اسی طرح حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم بھی ان سے غیر معمولی محبت فرماتے، حضرت مولانا سن میں ایک سال چھوٹے تھے، اس لئے ملاقات میں بڑی بے تکلفی رہتی، مفتی صاحبؒ نے کئی بار کہا: حضرت مولانا کو رائے قائم کرنے میں بہت دیر ہوتی ہے، لیکن فیصلہ بہت صحیح صادر کرتے تھے، مختلف مزاج لوگوں کو ساتھ جوڑ کر چل رہے ہیں‘‘ اور کبھی کبھی کوئی لطیفہ بھی سناتے، اور ہنستے بھی، حضرت مولانا مدظلہ کو ان پر بہت ہی علمی اعتماد تھا‘‘ (تعمیر حیات خصوصی شمارہ)

مادر علمی سے عشق

حضرت مفتی صاحبؒ کے امتیازات میں ایک مادر علمی سے عشق بھی ہے، شجر سے پیوستہ رہنے اور بہار سے امید رکھنے کے ساتھ بہار سے مستفید ہونے کی مثال مفتی صاحب کی زندگی میں نظر آتی ہے، ندوہ سے ان کو تعلق نہیں عشق تھا، اعظم گڑھ لکھنو سے بہت دور نہیں، پھر اعزہ واقارب بھی موجود، مگر مفتی صاحب کا حال کہ تعلیم کے دنوں کے علاوہ چھٹیوں میں بھی یہیں قیام کرتے، ندوہ کے احاطہ میں رہ کر بھی مفتی صاحب نے ایک بھر پور زندگی گزاری، ایک زمانہ میں گائے بھی پالتے تھے، بکرا پالنا، سبزیاں اگانا مفتی

صاحب کا خاص ذوق رہا، اوران حوالوں سے مفتی صاحب کے لطائف بھی ڈھلتے گئے، کبھی مستفتی کو گائے کی خدمت کرتے شخص کو پہنچاننے میں پریشانی ہوئی، کبھی سبزی کی کیاریوں کو پانی دیتے والے شخص کا تعارف 'مفتی صاحب' کی حیثیت سے کرایا گیا تو سامنے والے کی حالت دیکھنے کے قابل نظر آیا، غرض کہ مفتی صاحب نے اپنی دلچسپیاں اتنی پیدا کرلیں کہ پھر انہیں وطن کی یاد کبھی نہیں آئی۔

آپ کے عزیز مولانا ابوالبقاء ندوی نے ذکر کیا ہے کہ مفتی صاحب کو ایک زمانہ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے ملازمت کی پیش کش ہوئی، جس کو آپ نے قبول نہیں کیا، حالانکہ وہاں تنخواہ بڑی اچھی تھی، یہ دراصل مادری علمی سے تعلق ومحبت کا نتیجہ تھا۔

مادر علمی سے اس خاص تعلق کا نتیجہ تھا کہ ندوہ کے خلاف کوئی بات سننا گوارہ نہیں کرتے تھے، ندوہ کے مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے، نظام کے اعتبار سے جب کوئی کسی خامی کی طرف اشارہ کرتا تو آپ اس کی ہر ممکن توجیہہ کرتے، یہ آپ کی ذہانت کی بات تھی کہ کسی بھی معاملہ میں فوراً ذمہ داران کے منشاء کو سمجھ لیتے اور پھر اسی کے مطابق اس کام کو انجام دیتے، ندوہ سے عشق کا یہ حال تھا کہ مسائل ومعاملات کی توجیہ وتاویل اور انہیں شرعی لبادہ اوڑھانے میں مبالغہ تک پہونچ جاتے تھے، ایسے موقع پر یہ طے کرنا مشکل ہوجاتا تھا کہ آپ پر انتظامی رنگ زیادہ ہے یا افتاء کا ذوق۔

آپ کے نامور فضلاء

مفتی صاحبؒ نے نصف صدی سے زائد عرصہ تک تدریسی خدمت انجام دی، اس طویل عرصہ میں آپ نے طلبہ کی بڑی تعداد کو مستفید کیا، ان فضلاء میں متعدد ایسے ہیں جو اپنے اپنے میدان میں یکتائے روزگار ہیں، اور جو دین اور اشاعت علم کی عظیم خدمات انجام دے رہے ہیں، آپ کے شاگردوں میں مولانا سلمان حسینی ندوی، مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ، سابق شیخ الحدیث مولانا ناصر علی ندویؒ، فیصل ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر علی احمد ندوی، اسلامک سنٹر آکسفورڈ سے وابستہ ڈاکٹر اکرم ندوی اور ان جیسے نابغہ روزگار فضلاء شامل

ہیں، اس وقت خود دارالعلوم میں سینئر اساتذہ کے علاوہ بمشکل کوئی استاذ ہوں گے جنہیں مفتی صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل نہ ہو۔

سفر آخرت

اخیر کے چند سالوں میں مفتی صاحبؒ کے گھٹنے میں شدید درد پیدا ہوگیا، جس کی وجہ سے چلنے میں پریشانی ہونے لگی، یہ مرض دھیرے دھیرے بڑھتا گیا، اس درمیان متعدد بار اسپتال میں داخل ہوئے اور صحتیاب ہوکر واپس آئے، اخیر کے چند ماہ تکلیف بہت زیادہ ہونے لگی، مگر صبر وضبط کا یہ عالم تھا کہ اس کا اظہار کم ہی کرتے، متعلقین جب بار بار صحت کے بارے میں استفسار کرتے تو اتنا کہتے کہ بڑھاپا خود مرض ہے، اس حالت میں بھی جب کچھ بہتر ہوتے وہیل چیئر سے دفتر، مہمان خانہ، دارالافتاء جایا کرتے تھے، ۲۴ ستمبر کا دن بھی آپ نے معمول کے مطابق گزارا، طبیعت نارمل تھی، نصف شب طبیعت بگڑی، اور چار بجے صبح اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی، فجر کی نماز کے بعد ندوۃ العلماء کی مسجد میں یہ افسوسناک خبر لوگوں کو دی گئی، انتقال کی خبر سنتے ہی لوگوں کی بڑی تعداد میں ندوہ کا رخ کرنے لگے، طلبہ، اساتذہ، اور شہر کے متعلقین جوق در جوق جمع ہونے لگے، عصر بعد جنازہ کا اعلان تھا، دوپہر سے ہی لوگ جمع ہونے لگے اور عصر تک مجمع اتنا زیادہ ہوا کہ ندوہ کی وسیع وعریض مسجد وقت سے قبل ہی بھر گئی، اس اژدحام کو دیکھتے ہوئے آپ کی نماز جنازہ دارالعلوم کے میدان میں ادا کرنے کا فیصلہ ہوا، جنازہ میں اتنا زیادہ ہجوم تھا کہ گذشتہ چند سالوں میں کسی کے جنازہ میں اتنی بھیڑ نہیں دیکھی گئی، تقریباً پورا میدان لوگوں سے بھرا ہوا تھا، اور جب جنازہ قبرستان لے جایا جانے لگے تو ڈالی گنج پل سے قبرستان تک سفید پوش انسان ہی انسان نظر آرہا تھا، بالآخر مغرب سے قبل آپ کا جسد خاکی اس گنج شہیداں میں سپرد خاک کیا گیا جہاں درالعلوم کے اکثر اساتذہ مدفون ہیں۔

☆☆☆☆

نقوش وتاثرات

مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ

ایک عظیم شخصیت

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی
(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ جنہیں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں 'مفتی صاحب' کے نام سے جانا جاتا تھا، اب ہمارے درمیان نہیں رہے، آٹھ دہائیوں پر مشتمل ان کی زندگی کا ہر ورق علم ودین کی خدمت سے عبارت ہے، آپ کا وجود ایک ایسا سایہ دار درخت تھا ،جس کے نیچے نسلیں پروان چڑھیں، ایسا چشمۂ صافی تھا، جس سے تشنگان علم وفقہ سیراب ہوئے، ایسا آفتاب تھا جس سے ایک عالم کا عالم منور ہوا۔

مفتی صاحب نے ۱۹۲۷ء میں اس مادی دنیا میں آنکھیں کھولیں، اس طرح ان کی عمر ۸۹ سال تھی، ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں حاصل کی، ۱۹۴۴ء میں آپ ندوہ میں داخل ہوئے اور اپنی محنت ولگن سے فقہ اسلامی میں مہارت پیدا کی، ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم کے استاذ فقہ متعین ہوئے، اس موضوع پر انہوں نے دارالعلوم کے صدر مفتی استاذ محترم مولانا مفتی محمد سعید اعظمی ندویؒ سے خوب استفادہ کیا، مفتی صاحب کو ان سے رشتہ قرابت نے فائدہ اٹھانے کا خوب موقع فراہم کیا، ۱۹۶۰ء میں مفتی سعید صاحبؒ کی وفات کے بعد انتظامیہ کے مشورہ سے آپ شعبہ افتاء کے منصب پر فائز ہوئے، اللہ تعالی نے آپ کو بلا کا ذہن، حاضر جوابی، دقیقہ رسی اور فقہ وفتاویٰ پر زبردست مہارت عطا کی تھی، جس کی بدولت وہ طلباء وعوام کا مرکز توجہ اور دونوں میں یکساں طور پر مقبول تھے۔

آپ کی زندگی تواضع اور بے نفسی سے عبارت تھی، انکساری وبے لوثی آپ کا

طرۂ امتیاز تھا، ایک بے مثال فقیہ اور مختلف عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود تواضع کا یہ عالم تھا کہ جس کام پر لگا دیا گیا راضی بہ رضا تیار ہو گئے، ایک شہرۂ آفاق دینی درسگاہ میں مفتئ عام کے عہدہ پر فائز ہیں اور تعمیری کام بھی کئے جا رہے ہیں، دارالعلوم کو مالی تعاون کی ضرورت ہوئی تو اس کے لئے سفر بھی کر رہے ہیں، ذمہ داروں نے طے کر دیا تو ہاسٹل میں مقیم طلبہ کے مطبخ کا نظم وضبط بھی سنبھال رہے ہیں، اور پھر یونہی نہیں، سارے کام بحسن وخوبی انجام دئے جا رہے ہیں، آپ کا وجود باران رحمت کی طرح تھا، ہر ایک کو شامل، یا شعاع آفتاب کی طرح ہر ایک کو محیط ہے۔

آپ کی ان تنظیمی صلاحیتوں اور کام کے سلسلہ میں لگن اور اخلاص کو دیکھتے ہوئے ندوۃ العلماء میں پہلے نائب مہتمم اور پھر نائب ناظم کے عہدے پر فائز ہوئے، اور اس پر آپ کی علمی، فقہی اور تحقیقی ذمہ داریاں مستزاد تھیں، آپ ان تمام ذمہ داریوں کو حیات مستعار کی آخری گھڑیوں تک سنبھالتے رہے، جب تک سانس کا جسم وجان سے رشتہ نہیں ٹوٹا، ندوہ سے آپ کا رشتہ نہیں ٹوٹا، یہ ذمہ داریاں آپ نے دم واپسیں کے ساتھ ہی واپس کیں، ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۲۲رذی الحجہ ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۵رستمبر ۲۰۱۶ء کا سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ آپ کی زندگی کا آفتاب غروب ہو گیا، ستاروں کے بجھتے ہوئے چراغوں سے ابھی دھواں ہی نکل رہا تھا کہ آپ کی شمع حیات بجھ گئی۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

مگر اس آفتاب نے جاتے جاتے علم وفن، فقہ وفتاویٰ، اخلاص واحتساب اور تواضع وانکساری کے افق پر جو گہرے رنگ ڈالے، وہ کیونکر مٹ سکیں گے اور اپنے پیچھے ماہ وانجم کی جو قطاریں چھوڑ گیا وہ ان شاء اللہ اس شبِ تاریک میں نشانِ منزل ثابت ہوں گے۔

میں بذات خود بیشتر علمی، فقہی اور تنظیمی کاموں میں ان کے ساتھ شریک ہوا، میں نے پایا کہ وہ نہایت مخلص، صائب الرائے، دور بین اور عاقبت اندیش ہیں، ندوۃ العلماء، اس کی تاریخ اور یہاں کے اسلاف سے بے انتہا محبت کرنے والے ہیں، اور ان کے خلاف کوئی بے جا بات سننا گوارا نہیں کرتے۔

مفتی صاحب کلیۃ الشریعہ واُصول الدین کے عمید اور المعہد العالی للقضاء والافتاء کے نگراں رہے، اس کے لئے آپ نے اپنی ساری علمی اور فقہی توانائیاں صرف کر دیں، اور اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، فقہی سوالات کے جوابات جو آپ کے ذریعہ لوگوں کے استفسار اور استفتاءات کے طور پر دئے گئے بڑے معنی خیز اور مختصر وجامع ہوا کرتے تھے، خاص طور پر مسائل حاضرہ، عائلی قانون اور سماجی وثقافتی استفتاءات کے جوابات قابل آفریں واستفادہ ہیں، ان موضوعات پر آپ کی بڑی گہری نظر تھی، آپ کی فقہی آراء قرآن و سنت، اجماع امت اور قدیم فقہاء کے اجتہادات اور قیاس پر مشتمل ہیں۔

اسی طرح آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فقہی موضوعات اور کتب فتاویٰ کا درس بھی دیتے رہے، اور شعبۂ تدریب افتاء میں داخل ہونے والے طلبہ کی مشق وتمرین پر زور دیتے، اور قرآن وسنت کے مطابق فتوے دینے اور مسائل کو حل کرنے میں راہ اعتدال کو اختیار کرنے کی تعلیم دیتے اور اسی کی تربیت کرتے۔ مفتی صاحب کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی شفقتیں حاصل رہیں۔

آپ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک علم وفقہ کے اس بار امانت کو اٹھائے چلتے رہے، تورع وتفقہ اور علم وحلم کی یہ شان آخری دم تک باقی رہی، اخیر عمر میں مختلف قسم کے امراض میں مبتلا ہونے کے باوجود آپ نے انتظامی امور میں کبھی کوتاہی نہیں کی، زندگی کے اخیر زمانہ میں آپ ندوہ کے نائب ناظم متعین ہوئے، اس سے پہلے عرصۂ دراز تک آپ نائب مہتمم کے فرائض انجام دے چکے تھے، پیام اجل قبول کرنے تک آپ نے کبھی ادائے فرض پر تن آسانی کو ترجیح نہیں دی۔

مفتی صاحب کو دار العلوم سے بے پناہ محبت تھی، دار العلوم کی خدمت میں جان ومال کو قربان کیا، اور استقامت کے پیکر رہے، ان کے فتاوی مصادر شریعت کے مطابق اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والے تھے، ادارہ کے سلسلہ میں صائب الرأی تھے، لیکن حسب موقع سخت موقف بھی اختیار کرتے تھے، وفاداری، محنت، علم وتفقہ، اور احساس ذمہ داری، حلم وتواضع ان کی نمایاں خصوصیت ہیں۔

آپ کے انتقال کی خبر عام ہوتے ہی محبین کا تانتا بندھ گیا، نماز جنازہ کے لئے مسجد کے پہلو کی زمین کافی نہ ہوئی تو دار العلوم کے وسیع وعریض میدان میں نماز جنازہ ہوئی، اعزہ واقارب، دوست واحباب، رشتہ داروں اور ملنے والوں کے جم غفیر نے آپ کے جنازہ کی مشایعت کی، خود ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اپنے تمام تر ضعف وپیرانہ سالی کے باوجود جنازہ کی نماز سے لے کر آخری آرام گاہ پہونچانے تک موجود رہے، اور بالآخر آپ ڈالی گنج کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

اسی طرح بہت سے مدارس، جامعات اور کالجوں نے بھی ان کی وفات پر تعزیتی جلسے کئے اور مرحوم کی خدمات اور ستودہ صفات کا کھلے دل سے اعتراف کیا، اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ کی خدمات قبول فرمائے، آپ کی قبر کو نور سے بھر دے اور آخرت میں بہتر سے بہتر بدلہ دے، آمین۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اذا مات ابن آدم انقطع عنه عمله الا من ثلاث : صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعو له.

(جب ابن آدم کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال اس سے منقطع ہو جاتے ہیں، مگر تین چیزیں فائدہ پہونچاتی ہیں: صدقہ جاریہ، ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور ایسا لڑکا جو دعا کرے۔)

اللہ اپنے دامن عفو میں آپ کو جگہ دے، آپ کی لغزشوں کو درگزر فرمائے، آپ کی کاوشوں کا خاطر خواہ بدلہ دے، اعزہ واقارب اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

پھر تیرا وقت سفر یاد آیا!

مولانا محمد علاء الدین ندوی
(وکیل کلیۃ اللغۃ العربیۃ، دار العلوم ندوۃ العلماء)

قطع نظر اس کے کہ مفتی محمد ظہور ندوی صاحبؒ کو باکمال ہستیوں اور معروف شخصیتوں کے زمرے میں شامل کیا جائے یا ان کو شہرت وعظمت سے بے گانہ انسانوں کی قطار میں کھڑا کیا جائے، یا ایک عالمی ادارے سے عمر بھر کی وابستگی کو کمال دانائی سمجھا جائے، کچھ بھی ہو، مفتی صاحب بڑوں کی فہرست میں شامل ہوں یا نہ ہوں، البتہ انہوں نے شہرت وبڑائی سے دور رہ کر بڑے بڑے کام انجام دینے والے 'چھوٹوں' کا ساتھ دے کر زندگی کے رواں دواں قافلے کا ہم سفر ضرور رہے، دور سے ساحل کے تماشائی تو وہ کبھی نہیں رہے، ہاں موجوں کے تھپیڑوں کا انہوں نے سامنا کیا اور مصاف زندگی میں اپنے سمت سفر کا تعین کر کے تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے۔

ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا کہ ہم مفتی صاحب کو دیکھتے اور برتتے رہے، اس طرح کے دیکھنے، برتنے اور ملنے ملانے کی کوئی خاص اہمیت نہیں سمجھی جاتی مگر اس طرح کے برتاؤ اور مشاہدے کو جب شعوری احساس کے ساتھ موثر قلم کے ذریعے یادوں کے دریچے میں محفوظ کر دیا جاتا ہے تو بعد والوں کے لئے وہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کا پڑھنا اور جاننا مفید ثابت ہوتا ہے۔

ہمارے دینی ماحول میں گور غریباں کے تازہ مسافروں کے تذکرے کی بات آتی ہے تو تذکرہ نگار، قلم کار اور سخن طراز 'اذکروا محاسن موتاکم' کی روشنی میں مرنے والے کے حق میں کچھ یوں داد سخن دیتے اور خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ وہ سماج اور معاشرے کا انسان کم اور کسی خیالی دنیا کا انسان زیادہ نظر آنے لگتا ہے، اگر وہ کہیں مذہبی

انسان ہوتو اسے کرامات وکمالات کے ہالے میں کچھ اس انداز سے سجایا جاتا ہے کہ کتابی دنیا کا یہ انسان اپنے قاری کو مرعوب تو کر سکتا ہے مگر واقعات کی دنیا میں جینے والوں کے لئے آئیڈیل نہیں بن پاتا۔

ایسا نہ ہو تب بھی جانے والے کی قد وقامت کا صحیح اندازہ کئے بغیر اسے تعریف اور مناقب کا وہ لباس پہنایا جاتا ہے، جو اس کے قدِ راست پر فٹ نہیں بیٹھتا۔لفظوں کی قدر و قیمت اور اس کی حرارت (ٹمپریچر) کو جانے بغیر جب ہم کسی کی تعریف کا پل باندھتے ہیں یا اس کو بانس میں کھڑا کرتے ہیں تو ہم اس کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کرتے بلکہ اسے بھدا بنا کر چھوڑتے ہیں، جو انسان جتنا کچھ ہے، اسے اس کا حق دینا ہی صحیح سیرت نگاری (بائیوگرافی) ہے۔

مفتی محمد ظہور صاحب کی شخصیت کو جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، ان کی ذات میں حسب ذیل خصوصیات اور خوبیاں پائی جاتی تھیں، ان کے اندر دوسری خوبیاں بھی ضرور ہوں گی مگر میرے ذہن کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی:

مضبوط اعصاب: زندگی کے سفر میں ہر انسان کے حصے میں میٹھے میٹھے اور کڑوے کسیلے واقعات پیش آتے ہیں، مفتی صاحب نے بھر پور خاندانی زندگی بسر کی، ان کی زندگی میں بھی نشیب وفراز آئے ہوں گے، انہیں بھی مٹھاس کے ساتھ کرواہٹ برداشت کرنی پڑی ہوگی، واقف کار جانتے ہیں کہ وہ اپنی گھریلو زندگی میں بعض روح فرسا اور ہمت شکن حالات سے دوچار ہوئے، مگر وہ ہمت کے دھنی اور اعصاب کے اتنے مضبوط تھے کہ کبھی انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ غم ومصیبت کا کوئی پہاڑ ان پر گرا ہے۔وہ غم حیات کے زہر کو تقدیر کا تریاق سمجھ کر پی لینے کے ایسے عادی ہو گئے تھے کہ ان کے انداز گفتگو، سماجی سلوک اور رویہ زندگی سے کہیں بھی آلام ومحن اور کرب والم کا اظہار نہیں ہوتا تھا ؎

غم کو بنا کے محرم اسرار کائنات
ہر نقش غم کو پیکر انساں بنا دیا

ماحول شناسی: حضرت مفتی صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۹۲۷ء بتائی جاتی ہے، ۱۹۴۴ء میں وہ بحیثیت طالب علم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، ۱۹۵۱ء میں تعلیم مکمل کی، ۱۹۵۲ء میں معلم کی حیثیت سے دارالعلوم ہی میں ان کی تقرری ہوگئی، تب سے لے کر چند سال پیشتر تک وہ اپنی ذمہ داریاں نبھاتے رہے اور آخر وقت تک نائب ناظم کے منصب پر فائز رہے۔یہ طویل عرصہ انہوں نے اپنے مادر علمی میں گزارا اور بڑی کامیابی کے ساتھ گزارا، اس کامیابی کے عقب میں ان کی ذہانت، قابلیت اور ان کی ماحول شناسی کو بڑا دخل ہے، انہوں نے اول روز سے اس عظیم دانشگاہ کے نظام فکر وعمل اور اس کے رجحان اور موڈ کا ادراک کر لیا تھا، ندوۃ العلماء سے فکری ہم آہنگی ہی کی بات تھی کہ ع

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کے حکیمانہ مصرع (مقولے) کو حرز جان بنا لیا تھا، سمت سفر کا تعین کر کے انہوں نے مادر علمی میں پڑے رہنے کا فیصلہ کر لیا، اس طرح سے انہوں نے خود کو اپنے ادارے کے لئے ایک مفید کارکن ثابت کیا، اپنے مقصد سے وابستگی اور ماحول کی نبض شناسی کا ثمرہ بھی دیکھا اور زندگی کے آخری لمحات تک شجر سایہ دار سے وابستہ رہ کر یہاں کی بہاریں بھی خوب دیکھیں اور ان بہاروں کی فرحت بخش ہوا اور تراوٹ سے اپنے کو بھی شاد کیا۔

سادگی: مفتی صاحبؒ کی زندگی کا مشاہدہ کرنے والے سبھی اس بات کی گواہی دیں گے کہ ظاہری رکھ رکھاؤ، ٹیپ ٹاپ اور شان وشوکت سے تو آپ بہت دور تھے اور لاپرواہی کی حد تک سادگی پسند واقع ہوئے تھے۔انسان کا ظاہر اس کے باطن کا عکس اور زبان دل کا ترجمان ہوتا ہے۔اس لئے ان کی یہ ظاہری سادگی ان کی باطنی سادگی کی غماز تھی۔نام کے ظہور تھے مگر 'اظہار انا' کا تو ان میں شائبہ تک نہ تھا، خدا جانے کیا مصلحت تھی کہ ہمیشہ وہ ظہور و بروز اور انا (Ego) کے اثبات کی جگہوں سے دور ہی نظر آئے۔

تدریس و تعلیم: ۵۰-۵۵ سال تک مولانا تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے، مولانا پختہ صلاحیت کے مالک تھے اس لئے اس میدان میں بھی ان کا جو ہر چمکا ہوگا

،اس کی بین دلیل وہ ہزاروں طالبانِ علومِ فقہ وفتوی ہیں، جنہوں نے مولانا سے کسب فیض کیا اور خود فیض رساں بن گئے۔ راقم کو بھی عالیہ ثانیہ (درجہ ششم عربی) میں آپ سے **السراجی** پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن خود کی کوتاہی کی وجہ سے زیادہ استفادہ نہ کرسکا، بلکہ اس اثنا میں تجربہ یہ ہوا کہ مفتی صاحب کے گھنٹے میں طالب علم از خود اپنے جذبۂ شوق سے فائدہ اٹھا سکتا ہو تو اٹھالے، بصورت دیگر جسمانی طور سے درجے میں رہتے ہوئے بھی ذہنی اعتبار سے غائب رہے، یا سبق کے علاوہ کسی دوسرے کام میں مشغول رہے، مفتی صاحب ڈانٹ ڈپٹ کر ترغیب وتشویق پیدا کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائیں گے، بلکہ طالب علم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے، یہ مفتی صاحب کی حقیقت پسندی تھی کہ انہوں نے خود اعتراف کیا کہ 'میں کبھی بھی کامیاب استاذ نہیں رہا' صحیح بات یہ ہے کہ علمی لیاقت و قابلیت اور ٹھوس صلاحیت کے علاوہ مفتی صاحب کی ذات میں ایک مدرس کے جملہ اوصاف کے زیور سے کم ہی آراستہ و پیراستہ رہے، ہاں تنظیمی امور میں ان کی صلاحیتیں زیادہ بارآور ثابت ہوئیں۔

فتوی نویسی : مفتی صاحب زندگی بھر دارالعلوم سے جڑے رہے اور آخر کے چند سالوں کو چھوڑ کر دارالافتاء والقضاء کے فرائض انجام دیتے رہے، آپ اپنے سے پیش رو اور اپنے بہنوئی حضرت مفتی سعید صاحب مفتیٔ اعظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے جانشین کی حیثیت سے اس منصب جلیل پر فائز کئے گئے تھے۔ آپ کی فتوی نویسی کے سلسلے میں دنیا یہ بات حیرت کے کانوں سے سنے گی کہ مفتی صاحب اپنے جیب میں مہر رکھا کرتے تھے، آپ چلتے پھرتے فتوی دے دیا کرتے تھے، دقیق سے دقیق مسائل کے جواب بھی آپ فی الفور دے دیتے تھے، یہاں کوئی صاحب یہ نہ خیال فرمائیں کہ کیا ایسے جوابات ان کی فکر وخیال کا آفریدہ نہیں ہوتے ہوں گے؟ نہیں، ہر جواب شرع متین کے کلیات وجزئیات کے عین مطابق ہوتا تھا۔

اس سے بڑھ کر حیرت زا بات یہ سنی جائے گی کہ مفتی صاحب زمانۂ طالب علمی

کے علاوہ طالب علم کبھی نہیں رہے، راقم نے اپنے ۲۶-۲۷ سالہ ندوہ کے قیام کے دوران کبھی مفتی صاحب کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ کسی مسئلے کی تلاش وجستجو میں کسی کتاب سے مراجعت فرمانے کے لئے محو مطالعہ ہوں (یہ کوئی خوبی کی بات تو نہیں ہے، مگر) اس کا مطلب یہ ہوا کہ مفتی صاحب نے اپنے طالب علمی ہی کے زمانے میں ایسی ٹھوس صلاحیت پیدا کرلی تھی جو آخر وقت تک ان کا ساتھ دیتی رہی۔

مفتی صاحب اپنی فتوی نویسی میں غایت درجہ احتیاط ملحوظ رکھتے تھے، آپ کے جوابات میں الزامی جواب کا سا رنگ نظر آتا ہے، جس میں مستفتی کو اپنے استفتاء کا شرعی جواب تو مل جاتا ہوگا، لیکن جواب سے اسے سیری کم ہی حاصل ہوتی ہوگی۔ جو بھی ہو آپ کے فتاوی **ما قل و دل** کے مصداق ہوتے ہیں، آپ کے فتاوی کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں اور دسیوں جلدوں میں ان کے آنے کا امکان ہے۔ مفتی صاحب کا تنہا یہ علمی کارنامہ ہے جو اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔

منتظم: تدریس اور فتوی نویسی کے ساتھ ساتھ آپ انتظامی امور سے بھی ہمیشہ مربوط رہے۔ 'شعبہ تعمیر وترقی' (ندوۃ العلماء) کے نگراں، شبلی ہاسٹل کے ایک حصے کے نگراں، ایک مدت مدید تک نائب مہتمم اور آخر میں نائب ناظم کے منصب جلیل پر بھی فائز رہے، انتظامیہ کی ذمہ داری میں ایک تو اصول وقوانین کا نفاذ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کی پابندی کئے بغیر دنیا کا کوئی ادارہ ترقی کی شاہراہوں پہ دوڑ نہیں سکتا، دوسرا جن ماتحتوں پر قانون کا نفاذ کرنا ہوتا ہے انہیں اطاعت شعاری کے لئے رام کرنا اور فکری ہم آہنگی کی فضا قائم کرنا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب نے انتظامی امور کا فریضہ انجام دیتے ہوئے ہمیشہ اپنے بڑوں کے منشا و مدعا کو سمجھا، پھر اُسے برتا، اس طرح آپ نے جذبۂ اطاعت شعاری اور ادارے سے وفاداری کا عمدہ نمونہ پیش کیا۔

نگراں اور مربی: ہمارے مدارس کے ماحول میں نگرانی اور تربیت لازم وملزوم ہیں، مفتی صاحب ضابطے کے بھی نگراں رہے اور انجمن الاصلاح کے ایک طویل

عرصے تک مربی بھی رہے، مگر باسباب ووجوہ اس میدان میں اپنی حکمتوں ودانائیوں کے گہر لٹا کر اپنی دینی، فکری، علمی اور روحانی تربیت کی فیض بخشیوں کے گہرے نقوش طلبہ میں قائم نہ کرسکے، لیکن ضابطے کی ذمہ داریاں نبھانے میں کبھی کوتاہ دست نہ پائے گئے۔

توسع و تحمل: مولانا کے اندر جہاں سادگی، خاکساری اور اپنی انا اور شخصیت کو نمایاں کرنے کے معاملے میں بے نیازی پائی جاتی تھی وہیں آپ کے اندر توسع وملنساری کی صفت بھی تھی، وہ ایک عظیم ادارے کے ماحول میں تھے، جہاں بڑوں میں عالمی سطح کے لوگ اور چھوٹوں میں طلباء کی اکثریت تھی، بعض بڑوں میں علم وفن کا ایسا طنطنہ اور فضل وکمال کا ایسا رعب ہوتا ہے کہ ان کے حضور میں چھوٹوں کو زبان کھولنے کا یارا نہیں ہوتا، مفتی صاحب اس معاملے میں بے مثال تھے، وہ بڑے تھے اور ہر چھوٹے کو بھی منھ لگالیتے تھے، مفتی صاحب کے در دولت پر ہر شخص کی رسائی ممکن تھی، ان کی مجلس میں ہر کوئی ہر طرح کا مثبت ومنفی خیال ظاہر کرسکتا تھا، وہ کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے، بلکہ سنجیدگی اور خوش دلی سے سنتے تھے بلکہ کبھی کبھار بحث وتکرار بھی کرلیتے تھے، ہاں وہ اپنی بات پر اڑے رہنے کے عادی تھے اور کسی کی دلیل کو مان کر کم ہی قائل ہوتے تھے۔ وسعت ظرفی کا تو یہ عالم تھا کہ ادارے کے افراد (اور ہر ادارہ ایک علمی خاندان ہی ہوتا ہے) اپنے ہی گھر کی بعض خامیوں کو زیر بحث لاتے، یا خود مفتی صاحب کے کسی اقدام عمل یا فکر ورائے پر اشکال کرتے تب بھی انہیں ذرہ برابر ملال نہ ہوتا، اطمینان سے سنتے، پھر یا تو تاویل کرتے، یا دفاع کرتے، یا حجت پیش کرتے، کسی ناپسندیدہ بات پر آنکھیں دکھانا یا گستاخی کے زمرے میں شمار کرنا تو جیسے وہ جانتے ہی نہ تھے۔

مفتی صاحب ندوہ کے محدود ماحول میں ایک بھرپور زندگی گزارتے رہے، وہ رزم گاہ حیات میں نشیب وفراز سے گزرے، مگر انہوں نے کہیں پڑاؤ کیا، نہ ہمت ہاری۔ مفتی صاحب جلسے جلوسوں، ممبر ومحراب اور تالیف وتصنیف کے آدمی نہیں تھے، مگر مرد دانا تھے اور بات کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے، بوقت ضرورت خطاب بھی کرلیتے اور سلجھے ہوئے انداز

میں اپنی بات کہتے تھے، آپ کو سیمیناروں اور کانفرسوں سے بھی لگاؤ نہ تھا، مگر سامع کی حیثیت سے اور اپنوں کی دلجوئی کی خاطر یا کسی مصلحت کے پیش نظر شرکت کرلیتے تھے۔ آپ کی شخصیت وسراپا سے نہ علم چھلکتا تھا، نہ جھلکتا تھا، مگر فقہی موضوع کا گہرا علم دماغ میں گہرائی تک اترا ہوا تھا، جو ضرورت کے وقت نوک زبان پر آجاتا تھا، ملک گیر سطح پر وسیع الاطراف تعلقات آپ نے استوار نہیں کئے، مگر لکھنؤ اور کولکاتا میں خاصے لوگ آپ سے متعارف تھے اور لوگوں نے دیکھا کہ نماز جنازہ میں باشندگانِ لکھنؤ کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

ندوۃ العلماء دین و دانش کا عظیم قلعہ اور فکر وفن کا ایک کہکشاں ہے اور مفتی صاحب اس قلعے کے ایک ذمہ دار ووفادار سنتری اور اس کہکشاں کے ایک ستارہ تھے، وہ ستارہ ۲۵ ستمبر ۲۰۱۶ء کو روپوش ہوگیا، تو ہزاروں لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے سامنے اندھیرا چھاگیا۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز   پھر تیرا وقت سفر یاد آیا

وہ ۲۵ ستمبر کی رات تھی، جو ڈھلتے ڈھلتے فجر کی گود میں اتر آئی تھی، اُدھر مؤذن نے اللہ اکبر کی صدا بلند کی، اِدھر ملک الموت مفتی صاحب کے لئے رب کے حضور حاضری کا سندیسہ لے کر آپہنچا، آپ نے سر تسلیم ورضا خم کردیا اور سوئے منزل روانہ ہوگئے، اب وہ وہاں ہیں جہاں شکوے شکایتوں سے بے نیاز ہیں۔ اللہ ان کے حسنات کو قبول فرمائے، ان کے قصوروں کو معاف کرے، انسان کے لئے یہ کوئی عیب کی بات نہیں کہ اس سے قصور سرزد ہوجائے، کیونکہ وہ کتنا ہی باکمال اور اعلی درجے کا مومن ہو اس کا نامۂ اعمال صرف معیاری کاموں اور نیکیوں ہی نیکیوں سے لبریز نہیں ہوسکتا، انبیاء علیہم الاسلام کو چھوڑ کر کوئی بھی لغزش، خامی، کوتاہی اور کمزوری سے بالکلیہ پاک نہیں ہوسکتا، یہ تو اللہ کی رحمت بے پایاں ہے کہ وہ بندگی کا لازمی شرائط کو پوری کرنے والوں کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرماتا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آخرت کے اس مسافر کے توشۂ حسنات میں خوب اضافہ کرے۔

اللهم نقه من الذنوب كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس ۔

مفتی محمد ظہور ندوی رحمۃ اللہ علیہ

چند یادیں

مولانا عتیق احمد بستوی

(استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

قد آور و بلند قامت شخصیتیں یکے بعد دیگرے رخصت ہوتی جارہی ہیں، اور علم و تحقیق، فقہ و افتاء کی محفلیں سونی ہوتی جارہی ہیں، حضرت مولانا مفتی محمد ظہور صاحب بھی ۲۵ ستمبر ۲۰۱۶ء کو داغ مفارقت دے گئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم کی تکمیل کی اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے، نصف صدی سے زائد عرصہ تک تدریسی اور انتظام کی ذمہ داریاں انجام دیتے رہے ہیں، ۱۹۸۰ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی الحسنی دامت برکاتہ کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلما حاضر ہوا، اس کے بعد سے آج تک دارالعلوم سے وابستہ ہوں، اس طویل مدت میں مفتی ظہور صاحبؒ کو خوب دیکھنے پرکھنے، ان کے مزاج و مذاق کو جاننے کا بھرپور موقع ملا، اگر ان ۳۶ سالہ یادوں کو قلمبند کیا جائے اور موصوف کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کو قید تحریر میں لایا جائے تو کافی صفحات درکار ہوں گے، لیکن اس کے لئے فی الحال وقت و فرصت نہیں ہے، اس لئے عزیزم مولانا منور سلطان ندوی سلمہ کی فرمائش پر ذیل کی سطریں لکھوانے پر اکتفاء کر رہا ہوں۔

حضرت مولانا مفتی ظہور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خصوصیت ان کی سادگی اور تواضع تھی، اللہ نے انہیں بڑا علمی مقام دیا تھا، مدت دراز سے دارالعلوم ندوۃ العلماء

جیسی عالمی درسگاہ میں افتاء کی خدمات انجام دینے کی وجہ سے انہیں مسائل کا بڑا استحضار تھا، فتویٰ نویسی میں انہیں درک حاصل تھا، فتویٰ لکھنے میں انہی مراجع کی طرف رجوع کرنے کی کم ہی ضرورت پیش آتی تھی، ندوۃ العلماء میں بڑے بڑے عہدوں پر وہ فائز رہے، لیکن ان کی تواضع وانکساری اور خاکساری میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، بڑے مرنجان مرنج اور خوش مزاج انسان تھے، بے تکلف باتیں کرتے تھے، اور ہر طرح کی باتیں سننے کے لئے آمادہ رہتے تھے، ہر شخص بسہولت ان سے ملاقات کرتا تھا اور باتیں کرتا تھا، لباس و رہائش معمولی اور سادہ تھی، جو لوگ ان سے پہلے سے واقف نہیں تھے اچانک ان سے ملتے تھے وہ یہ نہیں سمجھ پاتے تھے کہ وہ اتنے بڑے عالم و مفتی اور متعدد عہدوں پر فائز منتظم ہیں، اپنے شاگرد اور چھوٹوں سے بھی بڑی بے تکلفی اور سادگی سے گفتگو فرماتے۔

شعبۂ افتاء کے وہ سربراہ تھے اور اخیر وقت تک سربراہ رہے، اگرچہ اخیر کے دو تین سالوں میں اپنے امراض و اعذار کی وجہ سے افتاء کے کاموں میں ان کی سرگرمی بہت محدود ہوگئی تھی، حضرت مولانا ناصر علی صاحب مرحوم ان کے شاگرد تھے، کافی عرصہ سے شعبہ افتاء کی زیادہ تر ذمہ داریاں حضرت مفتی ظہور صاحب کے نائب کی حیثیت سے انجام دیتے تھے، لیکن معذوری سے پہلے حضرت مفتی صاحب ہفتہ میں کئی بار دارالافتاء تشریف لاتے تھے، مولانا ناصر علی مرحوم کے حجرے میں تشریف لاتے، احقر بھی خالی گھنٹہ میں وہاں آجاتا تھا، بعض دوسرے اساتذہ اور دارالافتاء کے جونیئر رفقاء بھی ہوتے، کبھی کبھی کوئی استفتاء زیر بحث آجاتا یا کوئی نیا مسئلہ زیر گفتگو آتا تو مفتی صاحب ہر ایک کی رائے جاننا چاہتے تھے، بعض دفعہ ان کے نقطۂ نظر سے ہم جیسے خوب اختلاف کرتے اور بحث کرتے تو بھی وہ خوش دلی کے ساتھ باتیں سنتے اور کبھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ وہ اس بحث و گفتگو کو ناگوار سمجھ رہے ہوں، بلکہ ان کا انداز خوش دلی اور پذیرائی کا ہوتا، اگرچہ وہ اپنی رائے پر جمے رہتے، لیکن دوسری رائے کا بھی پورا احترام کرتے۔

حضرت مفتی صاحب کے روابط شہر میں بڑے وسیع تھے ،لوگ صرف مسئلہ مسائل کے لئے ان سے رجوع نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خانگی مسائل اور کاروباری مسائل میں بھی ان کی رائے معلوم کرتے اوران سے مدد لیتے ،شہر کے حضرات بڑی سہولت سے انہیں اپنے گھر لے جاتے اوران کے علم وفضل سے استفادہ کرتے ،انہیں کہی لے جانا بڑا آسان تھا، ہر سواری میں چلے جاتے ، بلکہ بعض دفعہ خود بھی وہ اہل تعلق کے یہاں بن بلائے پہونچ جاتے تھے ،لوگوں کے خوب کام آتے تھے اور شہر کے خواص وعوام ان سے رابطہ قائم کر کے اپنے مسائل میں رہنمائی حاصل کرتے تھے۔

حضرت مفتی ظہور صاحبؒ بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے ،ان کی خانگی حالات زیادہ بہتر نہیں تھے ،ایک لڑکے اور ایک لڑکی کے بارے میں وہ جس پریشانی و آزمائش میں رہے اگر دوسرے شخص ان آزمائش سے گزرتا تو ان کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا مشکل امر ہوتا،لیکن حضرت مفتی صاحب سخت سے سخت حالات کو صبر و شکر کے ساتھ جھیلتے تھے اور ہر حال میں اپنی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے ،ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں ہیں ،اور وہ شاگرد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ، ان سب کو ندوہ کی یاد کیساتھ حضرت مفتی صاحب کی یاد ضرور آئے گی اور سب ان کے لئے مغفرت ورحمت کی دعاء کررہے ہیں۔

حضرت مفتی ظہور صاحب کا تحریری علمی سرمایہ ان کے فتاویٰ ہیں ،افسوس ہے کہ ان کے کافی سالوں کے فتاویٰ محفوظ نہیں ہیں ،لیکن جب سے دارالافتاء کا باقاعدہ نظام قائم ہوا اور فتاویٰ کو محفوظ کرنے کا نظام عمل میں آیا ،اس کے بعد سے فتاویٰ بھی کافی ہیں ،فتاویٰ ندوۃ العلماء کی چند جلدیں جو شائع ہوئیں اس میں ان کے اچھے خاصے فتاویٰ شامل ہیں ،اس کی ضرورت ہے کہ ان کے تمام فتاویٰ کو ترتیب وتحقیق کے ساتھ شائع کئے جائیں ،اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور انہیں اپنی خصوصی رحمت میں جگہ دے۔

مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی
(استاذ معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء)

جانے والے تو اس دنیا سے روز جاتے ہیں لیکن جو گہرے نقوش اور دیرپا یادیں چھوڑ جائیں وہ کم ہی ہوتے ہیں ،مفتی صاحب نے ندوہ کے احاطہ میں تقریباً پون صدی گذاری ،ظاہر ہے ان سے کیسی کیسی یادیں وابستہ ہیں ،اور وہ بھی ندوہ کے مختلف شعبوں سے منسلک رہے ،اس لئے ان کا حلقہ بھی اسی کے بقدر وسیع تھا ،وہ جب طالب علم کی حیثیت سے ندوہ میں داخل ہوئے ، وہ آزادی کے قبل ۱۹۴۴ء کا وہ دور تھا جب سیاسی تحریکوں اور شخصیتوں کی سرگرمیاں ملک کو غلامی کے شکنجے سے نکالنے میں صرف ہورہی تھیں ،آزادی کے بعد ملک تقسیم کے بلاخیز حادثہ سے دوچار ہوا ، یہ دور ملک کی تاریخ کا سب سے نازک دور تھا۔

تعلیم سے تکمیل کے بعد وہ اسی ادارہ میں استاذ مقرر ہوئے ،ادارہ بھی شہرۂ آفاق ، ظاہر سی بات ہے مفتی صاحب کی استعداد وامتیاز نے ہی انہیں اس ادارہ کے ذمہ داران کو انتخاب کا موقع دیا ،مفتی صاحب نے تدریس کے ساتھ ساتھ اپنے انتظامی ذوق کا بھی ثبوت دیا تو ان کو انتظامی امور بھی محول کئے جاتے رہے ،اسی طرح ایک استاذ سے وہ نگراں ،صدر مفتی ، ناظر شعبہ تعمیر وترقی ،نائب مہتمم اور نائب ناظم کے اہم مناسب تک پہونچے ،ان مراحل کو طے کرنے کیلئے جہاں استعداد اور صلاحیت درکار ہوتی ہے ،وہیں معاصرین کی ’’کرم فرمائیوں‘‘ اور ’’محسنوں‘‘ کی ذرہ نوازیوں سے بھی نمٹنا پڑتا ہے ،ذمہ داران کے مزاج وطبیعت کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے ،اور کارہائے مفوضہ کیلئے حسن کارکردگی کا بھی مظاہرہ کرنا پڑتا ہے ،مفتی صاحب دھن کے پکے تھے ،اس لئے جو کام ملتا خاموشی سے

اورخلوص سے اس میں لگ جاتے ، اوراس کو بخوبی انجام دیا کرتے تھے، ان کا یہی جذبہ اورخلوص ان کوترقی کی بلند منزلوں پرلے گیا، صحیح ہے

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دارورسن کہاں

مفتی صاحب کا وطن

مفتی صاحب ۱۹۱۷ء میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، آپ کے والد عبدالستار خان فارسی داں اورزمیندار تھے، مفتی صاحب کا وطن ضلع اعظم گڑھ کے مردم خیز قصبہ مبارک پور کا ایک محلّہ ہے، جو"سکٹھی پورہ صوفی بہادر" کے نام سے جانا جاتا ہے، مبارک پور کے مغرب میں ایک قبرستان ہے، قبرستان ختم ہوتے ہی سکٹھی پورہ صوفی بہادر کی آبادی شروع ہوجاتی ہے، غالبًا یہ آبادی ایک فوجی افسر صوفی بہادر کی جانب منسوب ہے، یہ ہمایوں دور کا فوجی افسر تھا، تاریخ میں جس کا نام ملتا ہے، اس دور میں بلاد پورب، بنگال و بہار میں بڑا انتشار تھا، شاہجہاں نے اس کا خاتمہ کیا، ان واقعات کی تفصیل محمد صالح کنبوہ کی کتاب "عمل صالح" میں موجود ہے، ۱۰۴۶ھ میں بھوجپور کی جنگ وفتح کے سلسلے میں صوفی بہادر کا نام ملتا ہے، مؤرخ اسلام قاضی اطہر مبارکپوری نے اپنی کتاب 'دیار پورب میں علم وعلماءٴ' میں لکھا ہے کہ "غالبًا اسی فوجی افسر بہادر کے نام پر سکٹھی پورہ صوفی بہادر بستی ہے جو اب مبارک پور کا محلّہ ہے اور پورہ صوفی کے نام سے مشہور ہے" (ص:۱۱۱)

قاضی صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تفصیل سے بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ راجہ اعظم خان بانی اعظم گڑھ کے بھائی راجہ عظمت بانی عظمت گڑھ کے بیٹے راجہ مہابت خان تھے، ان کے بیٹے بابو صوفی بہادر تھے غالبًا یہی صوفی بہادر ہیں جن کے نام پر پورہ صوفی بہادر ہے، قرین قیاس ہے کہ مؤخر الذکر صوفی بہادر ہی کے نام پر اس آبادی کا نام پڑا ہوگا۔

ماہنامہ صدائے مروہ لکھنؤ

تعلیم و تربیت:

مفتی صاحب کی ابتدائی تعلیم سکٹھی کے مدرسہ ریاض العلوم میں ہوئی شرح جامی تک مدرسہ احیاء العلوم مبارکپور میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ۴۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، اور یہیں سے ۵۰ء میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی، مفتی صاحب نے ایک بار بتایا تھا کہ میں نے قدوری، نور الایضاح، مقامات حریری وغیرہ قاضی اطہر مبارکپوری سے مدرسہ احیاء العلوم میں پڑھیں، ویسے تو قاضی اطہر مبارکپوری احیاء العلوم میں دوبار مسند درس پر متمکن ہوئے، پہلا مرحلہ شوال ۱۳۵۲ھ سے محرم الحرام ۱۳۶۴ھ کا ہے، ساڑھے چار سال اسی زمانے میں قاضی صاحب علم الصیغہ، نور الایضاح، قدوری، شرح نقایہ کبری، ہدیہ سعدیہ، ملاحسن، مقامات حریری، سبعہ معلقہ، مقدمہ ابن خلدون وغیرے کا درس دیا، دوسرا دور یکم اکتوبر ۴۶ء تا جنوری ۴۷ء پانچ ماہ پر مشتمل تھا، اس وقت مفتی صاحب ندوہ پہونچ چکے تھے۔

ندوہ میں مفتی صاحب نے متعدد اصحاب فضل وکمال سے کسب فیض کیا، جن میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی بھی ہیں، اس کے علاوہ مولانا ابوالعرفان خاں ندوی، مولانا اسحاق سندیلوی اور شاہ حلیم عطاء صاحب سے بھی تعلیم حاصل کی۔

تاہم مفتی محمد سعید صاحب سے خصوصی تعلق رہا، ان کی تربیت اور توجہ نے مفتی صاحب کی صلاحیتوں میں نکھار اور چمک پیدا کی، اور آگے چل کر اپنے فضل وکمال اور علمی وانتظامی مہارت کا لوہا منوایا۔

مفتی بھی قاضی بھی:

مفتی صاحب پورے دارالعلوم کے تنہا مفتی تھے، اور دارالافتاء کی مستقل عمارت سے قبل چلتے پھرتے دار الافتاء بھی تھے، جب عمارت بنی تو پورے شعبہ المعہد العالی للقضاء والافتاء کے صدر بنے اور شہر سے دار القضاء بھی اسی عمارت میں منتقل ہوگیا تو مفتی

ستمبر واکتوبر ۲۰۱۶ء

صاحب قاضی کونسل کے رکن بنے، اور دارالافتاء میں مولانا ناصر علی صاحبؒ مولانا برہان الدین صاحب اور مولانا عتیق احمد بستوی صاحب اور مفتی صاحب کو تصویب کا مجاز قرار دیا گیا، اس طرح مفتی صاحب افتاء کا کام بھی انجام دیتے، اور قضاء کا بھی، عموماً جو حضرات صرف شعبہ افتاء سے منسلک ہوتے ہیں ان کے سامنے جو مسائل آتے ہیں، صورت مسئولہ کہہ کر فتوے کا جواب دیدتے ہیں، اور بری الذمہ ہوجاتے ہیں، لیکن وہ فتویٰ جب عوام کے درمیان جاتا ہے تو جس فریق کے موافق ہوتا ہے وہ اس کو دلیل بناتا ہے، اور فریق مخالف مخالفت کرتا ہے، ہندوستان میں بہت سے استفتاءات میڈیا کا بھی ہدف بنتے ہیں، اور پورے ملک میں کسی مسئلہ اور اس کے جواب کو بنیاد بنا کر مسائل کو اچھالا جاتا ہے، مفتی صاحب چونکہ قاضی بھی تھے اس لئے وہ اختلافی مسائل میں بڑی ہوشمندی کا ثبوت دیتے تھے اور جواب میں بڑی احتیاط برتتے تھے، یوں تو وہ ہر مسئلے کا جواب برجستہ اور پختہ تحریر میں دیتے تھے، کہیں کوئی سقم نہ نکال سکتا، لیکن ایسے مسائل میں جو آگے چل کر کوئی اختلافی صورت اختیار کریں، مفتی صاحب اس جھلک کو محسوس کر لیتے اور جواب میں بڑی زیرکی کا ثبوت دیتے تھے، مثلاً اختلافی عائلی مسائل میں ''دارالقضاء سے رجوع کریں'' یا عوامی اختلافی مسائل میں ''مل کر زبانی بات کریں یا مقامی علماء سے رجوع کریں''، کہہ کر مزید اختلافات کو ابھرنے کا موقع نہ دیتے تھے۔

مجھے یاد ہے فتح پور جامع مسجد میں امامت کا اختلاف ہوا، امام صاحب جو ایک بڑے عالم ہیں ان سے خلاف بہت سا مواد تیار کر کے مخالف افراد نے ملک سے کئی بڑے اداروں سے فتویٰ حاصل کئے، انہوں نے ''صورت مسئلہ میں مذکور امام کے پیچھے نماز درست نہیں ہے''، وغیرہ وغیرہ جواب دیا، دارافتاء ندوۃ العلماء میں کئی بار دیگر فتاویٰ کو منسلک کر کے بھیجا تھا لیکن مفتی صاحب نے ہمیشہ ''مقامی علماء سے رجوع کریں'' یا ''زبانی بات کریں'' کہہ کر مسئلہ کو ٹال دیا، اس لئے اس طرح کے مسائل کی صداقت کا کوئی اعتبار

نہیں ہوتا اور دارالافتاء سے جواب پا کر مسائل میں مزید نزاکت پیدا ہوجاتی ہے۔

مفتی صاحب بڑے قوی حافظہ کے مالک تھے، بہت سے مسائل جن کے لئے کتابیں کھنگالنی پڑتی ہیں، اور عرق ریزی کرنی پڑتی ہے، مفتی صاحب سوال پڑھتے ہی اس کا جواب تحریر کر دیا کرتے تھے، بعض مرتبہ مولانا ناصر صاحبؒ نے مفتی صاحب سے کسی مسئلہ میں رجوع کیا اور ایسا بھی ہوا کہ بعض مسائل میں مولانا برہان الدین صاحب اور مولانا عتیق احمد بستوی صاحب بھی شریک ہوئے، لیکن عموماً مفتی صاحب کی رائے میں زور دکھا اور اس کے مطابق جواب دیا گیا، مفتی صاحب کے قوت حافظہ کی وجہ سے انہیں کتاب کا سہارا نہیں لینا پڑتا تھا، اور کم وقت میں زیادہ مسائل حل ہوجاتے تھے، اس لئے فوری جواب چاہنے والوں کو یا تو مفتی صاحب کے پاس بھیج دیا جاتا یا پھر تمام استفتاءات مفتی صاحب کے حوالہ کر دئے جاتے اور وہ فوراً جواب تحریر کر دیتے۔

سادگی و متانت کے پیکر:

سادگی مفتی صاحب کا امتیازی عنصر تھا، سادگی بھی ایسی ویسی نہیں، اگر کسی کے دل میں مفتی صاحب کی عظمت اور ان کے جلال کا تصور ہو اور پھر اس کی ملاقات مفتی صاحب سے ہو تو اسے یقین کرنا مشکل ہو کہ یہی مفتی صاحب ہیں، بارہا ایسا ہوتا کہ مفتی صاحب سے ملنے والوں کو شبلی ہوسٹل بھیج دیا جاتا اور وہ پھر واپس آجاتے اور ملاقات نہ ہونے کی بات کرتے، اس لئے کہ کبھی مفتی صاحب اپنے گھر سے متصل آراضی پر آلو کی کھیتی میں مشغول ہوتے تو کبھی اپنی سادگی کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے ہوتے اور ملنے والے کے تصوراتی کروفر نہ ہونے کی وجہ سے وہ یہ سمجھ کر واپس ہوجاتا کہ مفتی صاحب کب ہوسکتے ہیں، عموماً میں نے ان کے کپڑوں کو استری سے خالی پایا، شیروانی زیب تن کرتے تو کرتا نیچے سے جھانک رہا ہوتا، اتنے بڑے عہدہ پر فائز ہونے کے باوجود مفتی صاحب میں کبھی عہدہ کا کروفر نہ دیکھا، نہ انہوں نے کسی سے زور سے بات کی۔

مفتی صاحب ایک عرصہ تک بے خوابی کے مرض میں مبتلا رہے لیکن جب دار الافتاء میں ہوتے تو ہشاش بشاش نظر آتے اور پورے نشاط سے کاموں کو نمٹاتے تھے، ان کو دیکھ کر بالکل احساس نہ ہوتا کہ رات میں ان کی نیند پوری نہیں ہوتی ہے، گھریلو مسائل اور خاندانی مشکلات کس کے ساتھ نہیں ہوتی ہیں، لیکن مفتی صاحب جن مسائل ومشکلات سے دوچار تھے یقیناً وہ ہر کسی کو نہیں پیش آتے اور اگر پیش آجاتیں تو اس طرح استقامت کے ساتھ ان کو جھیلنے کا ہنر تو صرف مفتی صاحب نے ہی جانا تھا۔

مفتی صاحب کا حلقۂ عقیدت بہت وسیع تھا، خاص طور سے لکھنؤ کے دیندار اور اہل ثروت طبقہ میں مفتی صاحب سے عقیدت رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد تھی، مفتی صاحب اس تعلق کا خیال رکھتے تھے، اور خود بھی ان کی خیر خیریت دریافت کرنے ان کے گھر جایا کرتے تھے یا کسی خاص مناسبت سے آمدورفت کا تعلق رکھتے، یہی امور تعلقات کی وسعت کی بنیاد ہوتے ہیں، عموماً بڑے اداروں کے احاطوں میں ایک بندھی ٹکی زندگی گذارنے والے اس معاشرتی پہلو پر توجہ نہیں دیتے اور ایسی شان بے نیازی اختیار کرتے ہیں کہ گویا وہ معاشرے کا حصہ ہی نہیں ہیں، مفتی صاحب اس سے مستثنیٰ تھے وہ فوقتاً فوقتاً اپنے وطن بھی آتے جاتے اور اعظم گڑھ کے حلقۂ رفقاء وارادت کے خوشی وغم میں برابر شریک ہوتے۔

مفتی صاحب کی سب سے بڑی خوبی ان کا سہل الحصول ہونا تھا، وہ بآسانی مل جاتے اور ان سے بے تکلف بات کی جاسکتی تھی، نہ چھوٹے بڑے کا تکلف، نہ استاد شاگرد کے رشتہ کی پاسداری، وہ ہر کسی سے بے تکلفی سے بات کرتے، ہر فریق کی بات کو قاعدہ سے سنتے اور اپنے جواب سے اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے، چونکہ وہ ایک ذمہ دار بھی تھے اور ندوہ کے انتظامی امور میں ان کا بہت دخل تھا، اس لئے لوگ جو بات کسی سے نہ کہہ پاتے، مفتی صاحب سے بآسانی کہہ دیا کرتے تھے، مفتی صاحب کبھی تو ادارہ کے حق

میں جواب دیتے اور کبھی اپنا ظریفانہ جواب دے کر لاجواب کردیتے، ندوہ میں مکانوں کے الاٹمنٹ کے لئے ایک ضابطہ بنا کہ اب کسی کو بھی مکان نہیں دیا جائے گا، اس کی باقاعدہ ایک کمیٹی بنی، تھوڑی ہی عرصہ کے بعد ایک صاحب کو مکان الاٹ ہوا، مکان کی ضرورت مندوں میں سے ایک نے مفتی صاحب سے اس سلسلے میں بات کی، چونکہ مفتی صاحب بھی اس کمیٹی کے رکن تھے، ضابطہ پوچھنے پر مفتی صاحب نے بتایا کہ کمیٹی نے الاٹمنٹ پر پابندی عائد کردی ہے، ان صاحب کو موقع مل گیا اور فوراً کہا کہ فلاں صاحب کو تو اس کے بعد مکان دیا گیا ہے، مفتی صاحب نے برجستہ کہا 'تو فلاں بن جاؤ، تو فلاں بن جاؤ'، تعمیرات سے منسلک ہونے کی وجہ سے مکان کے جھگڑے اور رہائش پذیر افراد کی بہت سی مشکلیں مفتی صاحب ہی حل کرتے تھے، نہ کسی ایک فریق کی بات سن کر کوئی رائے قائم کرتے نہ اس پر کوئی فیصلہ کرتے اور دوسرے فریق کے خلاف الجھتے، جب تک دوسرے فریق کی بات نہ سن لیتے، حالانکہ بعض مرتبہ مدعی فریق اپنے معاملہ کو اتنی مہارت سے رکھتا کہ دوسرے فریق کو بات کرنے کا موقع ہی نہ دیتا، لیکن مفتی صاحب کبھی بھی کسی ایک فریق کی بات سن کر کوئی رائے نہ قائم کرتے، دونوں کی باتیں سنتے پھر کوئی فیصلہ کرتے۔

ظرافت و حاضر جوابی:

مفتی صاحب کی ظرافت کے قصے بہت مشہور ہیں، وہ ایک مرنجان مرنج اور حاضر جواب شخص تھے، بڑے بڑے مسائل اپنی حاضر جوابی سے حل کردیتے، حاضر جوابی کے لئے حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے، مفتی صاحب کبھی اس سے بے پروانہ ہوئے، ایک بار قاضی اطہر صاحبؒ کے ایک صاحبزادے جو نیوزی لینڈ میں رہتے تھے ان کی صاحبزادی کا رشتہ لکھنؤ میں طے ہوا، انہوں نے اس سلسلے میں معلومات میرے ذمہ رکھیں تساہلی کی وجہ سے رشتہ طے ہوگیا اور میں معلومات نہ کرسکا، حسن اتفاق ایک ساتھی سے ملاقات ہوگئی جو اس محلّہ میں ٹیوشن پڑھاتے تھے اور اس خاندان سے بخوبی واقف تھے،

انہوں نے جو احوال بتائے تو میرے ہوش اڑ گئے، میں نے خالد کمال صاحب کو اطلاع کی، انہوں نے فوراً جواب دیدیا، ادھر ان حضرات نے اس کو غیرت کا مسئلہ بنا کر انتقام کا ارادہ کرلیا، اور شک کی سوئی میری طرف گئی، میں نے مفتی صاحب سے پوری بات بتائی، وہ لوگ بعض غلط عناصر کے ساتھ ندوے آئے تو میں نے انہیں لے جا کر مفتی صاحب سے ملوا دیا، مفتی صاحب نے اپنی حاضر دماغی سے اس طرح اس پورے مسئلہ کا رخ موڑ دیا کہ وہ حضرات لاجواب ہوکر واپس ہوگئے۔

ادارہ کے بہت سے مسائل میں لوگ مفتی صاحب سے گفتگو کرتے اور وہ اپنی حاضر جوابی سے ایسا جواب دیتے کہ لاجواب کر دیتے، ظرافت بھی خوب تھی ایک بار رمضان کے مہینہ میں ندوہ کے ایک محرر عبدالعلیم قدوائی مسجد کے سامنے سے گذر رہے تھے، مفتی صاحب کو مذاق سوجھا اور ان سے کہا رمضان کے مہینہ میں آپ کیسے نظر آرہے ہیں، وہ بھی بڑے حاضر جواب تھے برجستہ جواب دیا اپنے بڑوں سے ملنے چلا آیا۔

سردیوں میں دار القضاء کے باہر دھوپ میں کرسیاں کھوادی جاتیں، مولانا محبوب الرحمٰن ازہری صاحب اور مفتی صاحب دونوں حضرات بیٹھتے تو آپس میں خوب محفل جمتی، اور ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے، مفتی صاحب اسی حاضر دماغی کے پیش نظر صحافی، وکیل یا میڈیا سے متعلق افراد کو انہیں کے پاس بھیج دیا جاتا اور وہ مفتی صاحب سے جن امور پر بحث کرتے مفتی صاحب ان کو لاجواب کر دیا کرتے، چونکہ میڈیا کے افراد عوام کے چٹخارے کیلئے بلا وجہ مسائل میں لوگوں کو پھنسا کر اور الٹے سیدھے جواب دلوا کر اس کو تشہیر کا ذریعہ بناتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کے جواب سے وہ اپنے اس مشن میں نامراد ہوکر واپس ہوجاتے۔

وفاداری بشرط استواری

مفتی صاحب ندوہ میں پلے بڑھے اور یہیں پیوند خاک ہوئے، انہوں نے

ادارہ کیلئے اپنی زندگی وقف کردی تھی، نہ مستقل کوئی مکان بنایا اور نہ ہی کسی ادارہ یا جمعیت کی تعمیر کی، اس دور میں یہ بھی ایک نادر نظیر ہے، بہت کم لوگ ہیں جو کسی ادارہ کیلئے خود کو اس قدر یکسو کر پاتے ہیں، ذاتی مسائل، گھر خاندان کے مشاغل اور پھر ادارہ اور جماعت کی مصروفیات، مفتی صاحب ان تمام مصروفیات سے مبرا و منزہ تھے، اس لئے چاہے تعطیل کے ایام ہوں یا کسی اجلاس میں اکابر ندوہ کی شرکت، دن کی گہما گہمی ہو یا رات کا سناٹا، ندوہ کو جب کسی ذمہ دار کی ضرورت پڑتی تو مفتی صاحب موجود رہتے۔

جب اطہر ہاسٹل پر ریڈ پڑا تو رات کا وقت تھا، ہر طرف پولیس نظر آرہی تھی، طلبہ بے چین بھی تھے، مشتعل بھی، اس وقت بھی طلبہ کے اژدحام میں مفتی صاحب نظر آرہے تھے، جو طلبہ کو کسی اقدام اور فیصلہ سے روکے ہوئے تھے، یہ اور اس طرح کے بہت سے مواقع پر مفتی صاحب حاضر رہے، خاص طور سے رمضان کے ماہ میں جب کوئی سفر پر ہوتا ہے اور کوئی اپنے وطن میں، مفتی صاحب تمام عہدوں کی ذمہ داریاں نبھاتے نظر آتے، مسجد میں بیٹھ کر عموماً تلاوت کرتے رہتے اور مختلف شعبہ جات کے کاغذات آتے اور وہ دستخط کر کے نپٹاتے رہتے، سفراء تصدیق کیلئے آتے ان سے جرح کرتے ہوتے وہیں نظر آتے، مفتی صاحب اگر نہ کر دیتے تو کوئی ان کو قائل نہیں کرسکتا تھا، اور اگر ہاں کر دیتے تو کوئی موڑنے والا نہ ہوتا، الغرض انہوں نے وفاداری بہ شرط استواری، اور پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ پر عمل پیرا ہوکر وہ بلند درجات حاصل کئے جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔

وہ ادارہ کیلئے مخلص تھے اور یہ اخلاص اسقدر کوٹ کوٹ کر بھرا تھا کہ وہ شعوری طور پر ادارہ کو شمہ بھر نقصان میں نہیں دیکھ سکتے تھے، انہوں نے اپنے تن سے اور اپنی صلاحیتوں سے ادارہ کو جلا بخشنے اور اس کو فائدہ پہونچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، اور ادارہ کو نعم البدل سے نوازے۔ (آمین)

ایک آفتاب علم تھا وہ بھی غروب ہوگیا

مولانا شیخ علیم الدین ندوی
(جامعہ اسلامیہ کاشف العلوم، اورنگ آباد)

۲۵ ستمبر ۲۰۱۶ء کی صبح، اذان فجر کے وقت بذریعہ فون اطلاع دی گئی کہ مولانا مفتی محمد ظہور ندوی صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ خبر بجلی بن کر گری۔ شمالی ہند کے مدارس عربیہ میں سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فیض حاصل کرنے والے علماء اور اس ادارہ سے وابستہ افراد کیلئے یہ واقعہ یقیناً ایک اندوہناک اور کربناک ہے۔ دینی مدارس میں درس و تدریس، طالبان علوم نبوت کا دارالاقامہ میں تربیتی نظام، طلباء کو دینی و شرعی علوم خاص طور پر فقہ و فتاویٰ میں ماہر بنانا اور مشق و تمرین کرانا، اور ان سب مراحل سے پہلے تعلیم و تعلم کیلئے اچھا، صاف ستھرا ماحول، سلیقہ مند عمارتیں، اور کتب خانے کو منظم کرنا نہایت ہی اہم امور ہیں جنہیں مرحوم نے اپنی زندگی میں نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ انجام دیئے۔

۱۹۷۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے بعد جن شخصیات اور اساتذہ کرام کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کیمپس میں متحرک، فعّال اور ہر محاذ پر ایک سپاہی کیطرح چاق و چوبند کھڑا ہوا دیکھا ان میں مفتی محمد ظہورؒ کی شخصیت سرفہرست ہے، دارالعلوم میں قدم رکھتے ہی آناً فاناً اپنی تعلیم اور تربیتی حالت میں نمایاں فرق محسوس ہونے لگا، سیدی و مرشدی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسن ندویؒ کی مجالس اور پند و نصائح، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ اللہ کے دروس و محاضرات، مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ اللہ العالی کے عربی و اردو مفید مضامین، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی کے دروس مواعظ و خطبات جمعہ، مولانا ناصر ندویؒ کے درس فقہ اور مولانا

ضیاء الحسن ندویؒ کے درس حدیث نے ایک نیا علمی ذوق پیدا کیا اور اس گلشن علم کو دل و جان سے زیادہ عزیز بنا دیا۔

قیام کی سہولت دارالعلوم علامہ شبلیؒ میں حاصل ہوئی، اسکے نگران مفتی صاحبؒ تھے، ابتداءً اورنگ آبادی اور پھر نام سے پکارتے رہے۔ مفتی صاحبؒ کے خود اذان کے ساتھ ہی مسجد روانہ ہونے کے معمول کی وجہ سے نمازوں کی پابندی تھی، رات میں نماز عشاء کے بعد جلد سونا اور صبح تہجد کیلئے جلد بیدار ہونا استاذ محترم کا امتیازی وصف تھا، اذان فجر کے ساتھ ہی دارالاقامہ کی خاموش فضاء میں مفتی صاحبؒ کی مخصوص طلباء کے ناموں سے آواز گونجتی، اٹھو جاگو، سبھوں کو جگادو، اس صداء کے بلند کرتے ہوئے یہ مرد مجاہد سردی کی سرد ترین راتوں میں مسجد کیطرف رواں دواں ہوجاتا، مسجد کی صفوں میں عام طالب علموں کیطرح بیٹھ کر ذکر و اذکار میں مشغول ہوجاتا، اور سب کے مسجد سے جانے کے بعد تب خود مسجد سے نکلتا۔

مرحوم دارالعلوم کے تعلیمی اوقات میں ھدایہ اولین، اخیرین اور دیگر کتب کا درس دیتے۔ شعبۂ فقہ و افتاء کے مخصوص طلباء سے روزمرّہ کی زندگی سے متعلق، ہندوستان کے گوشے گوشے سے دارالافتاء سے طلبیدہ فتاویٰ کے جوابات تحریراً طلب کرتے، پھر حذف و اضافہ کے بعد اپنی دستخط اور دارالافتاء کے مہر سے فتاویٰ جاری کرتے۔

۱۹۷۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی کے بعد تعمیری کاموں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، رواق اطہر، رواق نعمانی، کتب خانہ علامہ شبلیؒ اور دارالعلوم مسجد کی توسیع کا کام یکے بعد دیگرے ہونے لگا۔ ان تعمیرات میں خاموش کوششیں اور دعائیں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور نائب ناظم حضرت مولانا معین اللہ ندویؒ کی کارفرما تھیں، وہیں حضرت مفتی صاحبؒ گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں بھوک و پیاس سے بے نیاز ہوکر مزدوروں اور مستریوں کی نگرانی بذات خود فرماتے۔ گھنٹوں مصروف رہ کر شعبۂ تعمیر و ترقی کے نگران کی حیثیت سے اپنے فرائض بجالاتے۔ دارالعلوم کے کاز اور کسی معمول امر میں جس سے دارالعلوم کی ساکھ متاثر ہوتی ہو یا کوئی مالی

آسمان فقہ واخلاق کا ایک تابندہ ستارہ

مولانا شہاب الدین ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

یہ دنیا فانی اور بے ثبات ہے، جو بھی یہاں آیا اسے جانا ضرور ہے، کوئی پا بہ رکاب ہے تو کوئی سراپا انتظار ہے، خدا کے بڑے برگزیدہ بندے بھی آئے، مجاہدات سے بھرپور زندگی گزاری، کارہائے نمایاں اور خدمات گراں مایہ انجام دیں اور اپنے رب کے حضور حاضر ہوگئے، اسی سنت خداوندی کے مطابق ہم سب کے محبوب و محترم استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد ظہور صاحب ندوی ۲۲/ذی الحجہ/۱۴۳۷ھ کو ہم سبھی کو سوگوار اور پوری ملت اسلامیہ کو غمگسار چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور طویل مخلصانہ خدمات سے بھرپور زندگی گزار کر مالک حقیقی سے جاملے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

حضرت مفتی صاحب کا سانحہ ارتحال بلاشبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کیلئے آپ کے احباب و مخلصین، شاگردوں واعزاء کیلئے خاص طور پر اور پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کیلئے عام طور پر عظیم خسارہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے، اس لئے کہ ایسی جامع کمالات شخصیات بہت دنوں بعد پیدا ہوتی ہیں، قسام ازل نے مفتی صاحب کو بڑی فیاضی کے ساتھ متنوع خوبیوں سے نوازا اور گوناگوں کمالات کا پیکر بنایا تھا، بلا کی ذہانت، علمی رسوخ، تدریسی مہارت، فقہی بصیرت، دوراندیشی و دوربینی، معاملہ فہمی و حاضر جوابی اور سادگی و قناعت جیسی اعلیٰ و بلند صفات حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کے اساسی ترکیبی عناصر تھے، جب آپ مسند درس پر جلوہ افروز ہوتے تو ایسے ماہر و باکمال، لائق و فائق اور کامیاب استاذ نظر آتے جس کو بیشتر درسی کتابیں تقریباً زبانی یاد تھیں، آنکھیں بند کئے ہوئے طلباء کی عبارت خوانی کی غلطیوں کی اصلاح فرمادیا کرتے تھے، اور پیچیدہ واہم ترین مسائل انتہائی سہل وآسان اسلوب میں ذہن نشیں کردیا کرتے تھے، طلباء آپ کے

نقصان ہوتا ہو کوئی صلح نہ کرتے۔ اور راضی نہ ہوتے، اپنے ماتحت اساتذہ کرام، خادم عملہ اور طلباء سے مساویانہ سلوک روا رکھتے، کسی سے کوئی امتیاز نہ برتتے، ہمیشہ سادہ کھانا پسند فرماتے، لباس زاہدانہ عالمانہ اختیار کرتے، اسلاف کے قدیم طرز پر سر کے بال منڈواتے، زندگی کے ہر گوشہ میں سادگی پائی جاتی تھی۔

دوران طالب علمی اور تدریس کے ابتدائی دور کا مطالعہ اتنا پختہ وسیع اور گہرا تھا کہ چلتے ہوئے طلباء کے فقہی سوالات کے جوابات چٹکیوں میں دے دیتے' جلسہ جلوس' اسفار' سیمیناروں اور کانفرنسوں سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی۔ اور نہ ہی تصنیف وتالیف سے خاص شغف' دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اُسکی چہار دیواری سے بے حد لگاؤ اور تعلق تھا۔ اپنے مفوضہ امور میں سستی کاہلی اور غفلت کبھی بھی نہ برتتے۔ تعریف وتوصیف کو قطعاً پسند نہ فرماتے۔ ان میں انتہائی انکساری اور تواضع تھا۔ ہر طبقہ کے افراد میں فوری گھل مل جاتے' دارالافتاء کی صدارت' اہتمام اور شعبۂ تعمیر وترقی کی دشوار گزار ذمہ داری کو اپنا فرض منصبی سمجھتے۔

جمعیت شباب اسلام اور جامعہ سید احمد شہیدؒ کے ناظم مولانا سید سلمان حسینی کی جانب سے ۸/ستمبر ۲۰۱۲ء کو دارالعلوم کے پانچ بزرگ اساتذہ کو تدریسی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ان میں ایک مرحوم مفتی ظہور ندوی تھے۔

طویل العمری کے باعث مفتی صاحبؒ کے قویٰ مضمحل ہوتے گئے۔ کمزوری اور نقاہت میں اضافہ ہوتا گیا۔ پھر بھی افاقہ محسوس کرتے ہی دارالعلوم' دارالعلوم کی مسجد' مہمان خانہ' اور متعلقہ شعبۂ جات میں حاضر ہوتے' ادھر کافی عرصہ سے علاج جاری تھا۔ ہر عیادت کرنے والے فرد سے مرحوم دعاؤں کی درخواست کرتے' خود کی تمنا اور آرزو یہی تھی کہ دم نکلے تو اس مادر علمی کے آغوش ہی میں نکلے۔ اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ہزاروں عقیدتمندوں نے کندھا دیا۔ اور نمناک آنکھوں سے رخصت کیا۔

يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ اِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةًفَا دْ خُلِىُ فِىُ عِبٰدِىُ وَادْ خُلِىُ جَنَّتِىُ.

حلقہ درس سے بیحد مطمئن ہوکر آپ کی تدریسی مہارت اور تفہیمی صلاحیت کا گن گاتے ہوئے اٹھتے تھے، مفتی صاحب نے اپنے پیچھے ہزاروں شاگردوں کا ایسا قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے جو دنیا کے کونے کونے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں تشنگان علوم کی علمی پیاس بجھانے میں مصروف ہے، جو بلاشبہ مفتی صاحب کیلئے عظیم صدقہ جاریہ ہے، وہ آپ کیلئے خلوص دل سے دعا گو ہے کہ خدائے کریم آپ کی گرانقدر خدمات کا اپنے شایان شان بدلہ عطا فرمائے، اور آپ کے ساتھ عفو وکرم کا معاملہ فرمائے، آمین

حضرت مفتی صاحب بحر افتاء وقضاء کے ایک ماہر شناور تھے، فقہی بصیرت، معاملہ فہمی اور دوراندیشی وباریک بینی آپ کے خاص اور نمایاں اوصاف تھے، جن کی افتاء کے میدان میں بڑی اہمیت ہے، آپ کے سامنے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل آتے، آپ کا ذہن رسا فی الفوران مسائل کی تہوں تک پہونچ جاتا اور معمولی تأمل کے بعد بہت جلد ان کے صحیح شرعی جواب تحریر فرمادیتے تھے، یا مسائل کو بتلا کر مطمئن کردیتے، غرضیکہ روح شریعت سے واقفیت، نصوص شرعیہ کا استحضار، فی الفوران کی طرف ذہن کی منتقلی، پیش آمدہ مسائل کی تہوں اور اس کے تمام گوشوں تک نگاہ کی رسائی، مفتی صاحب کے ساتھ خدائے کریم کے خصوصی انعامات تھے جن کی وجہ سے وہ بہت جلد ایک جید و متبحر عالم دین، ایک ماہر وصاحب بصیرت ومایۂ ناز فقیہ اور ایک محنتی ومخلص خادم ملت کی حیثیت سے مقبول خاص وعام ہوگئے، اور لوگوں نے ان سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ فللہ الحمد والمنۃ

مفتی صاحب کی ذات والاصفات گوناگوں خوبیوں کی حامل اور متنوع کمالات کی حسین مرقع تھی، وہ ایک طرف آسمان علم وفقہ کے ایک تابندہ ستارہ، مسائل فقہ کے بحر بیکراں اور علوم قضاء کے ماہر تھے، تو دوسری طرف زہد وقناعت، سادگی وتواضع وانکساری اور اخلاق کریمانہ میں علماء سلف کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے، نرم خوئی ومہربانی، شفقت و رحمدلی آپ کا بڑا نمایاں وصف تھا، طلبائے عزیز سے بے انتہا، شفقت ومحبت فرماتے تھے، دارالاقامہ کی نگرانی کے زمانہ میں طلبا کا کھانا وغیرہ کبھی بند نہیں کرتے تھے، بلکہ تربیت کے سلسلے میں نرمی ومہربانی کے اسلوب ہی کو مفید وکارگر سمجھتے تھے اور اسی کو اختیار کرتے

تھے، آپ کی سادگی مشہور خاص وعام تھی، اس کا حال یہ تھا کہ ہر شخص بے جھجک آپ کو جہاں چاہتا روک لیتا اور مسئلہ پوچھ لیا کرتا، یہ آپ کی سادگی ہی تھی کہ بے تکلف طلبا کی سائیکل پر پیچھے بیٹھ کر شہر چلے جایا کرتے تھے، اور عموماً سادہ اور بغیر پریس کئے ہوئے کپڑے استعمال کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ دارالعلوم کے دفتر میں تشریف لائے تو چپراسی کی بنچ پر بے تکلف بیٹھ گئے، جب لوگوں کی توجہ ہوئی تو کہا گیا کہ حضرت آپ یہاں کیوں بیٹھ گئے، صوفے پر بیٹھ جاتے، تو آپ نے بڑی سادگی سے فرمایا کہ کیا ہوا؟ اگر چپراسی میری کرسی پر بیٹھ جائے تو کیا وہ مفتی بن جائے گا، یا اگر میں چپراسی کی بنچ پر بیٹھ گیا تو کیا میں چپراسی ہوگیا، یہ ان کے اعلیٰ اور تواضع وانکساری کی بات تھی، یہ اور اس طرح کے انگنت واقعات ہیں، جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی شخصیت کا جمال وکمال، ان کی سادگی وتواضع کے پردہ میں چھپا ہوا تھا، اور اولین مرحلہ میں ان کی شخصیت کی گہرائی وگیرائی تک رسائی حاصل کرنا ہر ایک کیلئے ممکن نہیں تھا۔

حضرت مفتی صاحب منجملہ اور اوصاف کے بڑے حاضر جواب اور ظریفانہ مزاج رکھتے تھے، وہ سائل کے سوال سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے، خواہ وہ کتنا ہی پیچیدہ سوال رہے، بلکہ پورے اطمینان سے سوال سن کر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ایسے تشفی بخش جواب دیتے کہ تھوڑی دیر کیلئے سائل بھی آپ کی حاضر جوابی سے حیران رہ جاتا، مفتی صاحب کے مزاج میں ظرافت کی بھی خاصی آمیزش تھی جو موقع موقع سے چھلکتی رہتی تھی اور سامعین وحاضرین کو خوش اور باغ باغ کردیتی تھی۔

مفتی صاحب اپنی گوناگوں علمی وفقہی فضائل وکمالات اور مخلصانہ گرانقدر خدمات کے ساتھ ساتھ انتظامی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھے، آپ کے اندر چونکہ معاملہ فہمی، باریک بینی اور قوت فیصلہ کے جوہر پوری طرح موجود تھے، اس لئے دارالعلوم کے ذمہ داران کی طرف سے بڑے اہم انتظامی عہدے آپ کو تفویض کئے گئے اور آپ نے ان کا حق ادا کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی، ناظم ندوۃ العلما حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کے بہت قدیم

اور گہرے روابط تھے، یہاں تک کہ حضرت ناظم صاحب کیلئے آپ بڑا مضبوط سہارا اور معتمد علیہ تھے، اس لئے فطری طور پر مفتی صاحب کے انتقال سے حضرت ناظم صاحب پر سخت اثر ہوا، بلاشبہ اس عمر میں دیرینہ رفیق سے محرومی بڑا جانکسل حادثہ ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مفتی ظہور صاحب ندوی مسند تدریس کی زینت، دارالافتاء کی جان، باکمال و ماہر عالم دین، ندوے کے ایک دیرینہ و مخلص خادم، ماہر و باصلاحیت منتظم اور ایک سادہ و متواضع اور خلیق و ملنسار انسان تھے۔

خدا نے آپ کو عوام وخواص کے درمیان بے پناہ مقبولیت ومحبوبیت عطا فرمائی تھی، جس کی سب سے بڑی اور روشن دلیل، علماء وطلباء، اہل مدارس اور عام اہل تعلق مسلمانوں کا ہزاروں ہزار کا وہ جم غفیر تھا جو ان کے جنازہ میں شرکت کیلئے والہانہ ٹوٹ پڑا تھا جس میں ہر ایک محبت و وارفتگی کا پیکر اور غم والم کی تصویر بنا ہوا تھا۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دارالافتاء کی طرف سے شائع ہونے والی ’’فتاویٰ دارالعلوم‘‘ کی جلدیں افتاء کے میدان میں آپ کی گراں مایہ خدمات پر شاہد عدل ہیں، جن سے لوگ خوب خوب مستفید ہوئے اور آئندہ بھی استفادہ کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا، یہ فتاویٰ حضرت مفتی صاحب کی علمی پختگی اور فقہی بصیرت ومہارت کی روشن دلیل ہیں۔

جانے والا تو چلا گیا، مگر ہم کو یہ سبق دیتا گیا کہ اس دنیا میں کوئی ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔ عزت ومحبوبیت اور مقبولیت کا دارومدار صفات وکمالات، خلوص وللّٰہیت اور مخلصانہ خدمات اور گراں مایہ کارناموں پر ہے۔ لہٰذا ہم سبھی کو مفتی صاحب کی روشن زندگی سے یہی سبق لینا چاہیئے، اور اسی کی روشنی میں اپنی زندگی کا سفر طے کرنا چاہیئے۔

اس دعاء کے ساتھ اب اجازت چاہتا ہوں کہ خدا اس مرد باکمال، عالم بے مثال اور فقیہ مائے ناز کے ساتھ اپنے شان کریمی کے مطابق معاملہ فرمائے، ان کی خدمات کو قبولیت سے نواز کر ان کے درجات کو بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین ثم آمین

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل

مولانا محمد فرمان ندوی
(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ یہ خبر سنی گئی کہ ندوۃ العلماء کے نائب ناظم، صدر مفتی دارالقضاء والافتاء حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندوی ۲۵ر ستمبر ۲۰۱۶ء کو نماز فجر کے وقت عالم فانی سے رحلت فرما گئے، مفتی صاحب کی شخصیت بے شمار خوبیوں کا مجموعہ تھا، وہ وہ ایک شجر سایہ دار تھے، جس سے لاتعداد لوگوں نے فائدہ اٹھایا، ان کی علمی عبقریت، انتظامی صلاحیت، افتاء وقضاء میں مہارت وتفوق کا زمانہ شاہد ہے۔ وہ دراصل علامہ اقبال کے مؤمن کامل کا اعلیٰ نمونہ تھے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب وکارآفریں، کارکشا، کارساز

عوام وخواص ہر ایک نے مفتی صاحب کی رحلت کو محسوس کیا، سوشل میڈیا، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر بہت گہرے جذبات وتأثرات نشر کئے گئے، منظوم ومنثور اسلوب کلام میں ان کی خدمات کو سراہا گیا، ملکی رسائل وجرائد میں ان کے متعلق مضامین شائع ہوئے، ملک وبیرون ملک ان پر تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ اللهم اغفره وارحمه۔

مفتی صاحب اعظم گڑھ کے مشہور خطہ مبارکپور کے رہنے والے تھے، ۸۹ سال عمر پائی، تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے، اور اس شان کے ساتھ گئے کہ بقول شخصے: عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے، ندوہ کے میدان میں آپ کے جنازہ کا منظر قابل دید تھا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی، اطراف لکھنؤ اور دیگر علاقوں سے لوگ جنازہ میں شرکت کے لئے آئے:

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کا فضل ہے، جسے پروردگار دے

انسان اپنی خوبیوں سے پہچانا جاتا ہے، مفتی صاحب کی خوبیاں قابل تقلید بھی ہیں اور قابل ذکر بھی، ان کی ایک صفت ''یک در گیر محکم گیر'' ہے، بظاہر اس اصول کو برتنے میں نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلہ کی پرواہ کا سابقہ ہوتا ہے، بے شمار مسائل اور حالات سے گذرنا پڑتا ہے، اپنوں اور غیروں کی ''عنایتوں'' سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جو اس اصول پر کاربند ہوتا ہے وہی رشک گلستاں ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی ایک خوبی ان کی محنت وکوشش اور تعلق مع اللہ ہے، پوری زندگی اسی کے پابند رہے اور طلباء کو بھی اسی کی نصیحت کرتے تھے، ایک موقع پر طلباء کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''زندگی کی کامیابی کے لئے محنت اور تعلق مع اللہ شرط ہے، اسی سے دارین کی سعادت معلوم ہوتی ہے۔ اور بقول شاعر وفاداری بشرط استواری شرط ایمان ہے۔

عام گفتگو میں بھی مفتی صاحب ناصحانہ پہلو اختیار کرتے تھے، ان کی مجلسیں حکمت وموعظت سے لبریز ہوا کرتی تھیں، موضوعات متنوع، اور عناوین مختلف، لیکن ہر ایک پر سیر حاصل بحث، گویا آپ اسی کے مرد میدان اور میر محفل ہیں۔

☆ ایک موقع پر مفتی صاحب نے مسجد دار العلوم میں فرمایا کہ جانتے ہو: لقمان حکیم نے حکمت کہاں سیکھی؟ میں نے عرض کیا: آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: لقمان حکیم سے نقل کیا جاتا ہے: جب میں نے دیکھا کہ بے وقوف بے وقوفی کررہے ہیں تو میں نے عقل ودانش سے کام کرنے کا فیصلہ کیا، لقمان کی حکمت کا مشہور واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ شروع میں غلام تھے، ان کے آقا نے ایک مرتبہ ایک بکری دی، اور کہا کہ اس کا عمدہ حصہ ذبح کرکے لے آؤ، وہ گئے اور دل اور زبان لے کر آئے، پھر ان کے آقا نے ان کو دوسری بکری دی اور کہا کہ اس کا سب سے برا حصہ لے کر آؤ، وہ گئے، ذبح کیا اور دل اور زبان لے کر آئے، آقا نے سوال کیا تو جواب دیا کہ دل وزبان کا استعمال اگر صحیح ہے تو یہ سب

سے عمدہ اور اچھے اعضاء ہیں، اور اگر ان کا استعمال غلط ہو تو سب سے برے ہیں۔ سیدنا عمر فاروق کا یہ ارشاد کس قدر مبنی برحقیقت ہے: انما المرء بأصغريه۔ (انسان کا وجود اپنے دو چھوٹے اعضاء دل اور زبان کی وجہ سے ہے)۔

☆ مفتی صاحب کے سامنے ایک صاحب نے اپنے درد کا اظہار کیا، اور کئی لوگوں کے تعلق سے بے لاگ تبصرے کئے، مفتی صاحب خاموشی سے سنتے رہے، اخیر میں جواب الجواب، بلکہ سبق آموز نصیحت کے طور پر جگر کا یہ شعر پڑھا، جو موقع کے لحاظ سے معنی خیز تھا:

باہمہ ذوق آگہی ہائے سے پستی بشر
سارے جہاں کا جائزہ، اپنی جہاں سے بے خبر

☆ انھیں صاحب نے مزید کہا: حضرت! ہم لوگوں سے کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو بڑے ہماری گرفت فرماتے ہیں، آخر بڑوں سے بھی غلطی کا امکان ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا: ان کی غلطی کی اصلاح بلکہ گرفت اوپر والا فرمائے گا۔ اسی مناسبت سے عربی کا ایک شعر ہے:

وما من يد الا يد الله فوقها
وما ظالم الا سيبلى بظالم

(یعنی ہر ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے، اور ہر ظالم کو اس سے بڑے سے سابقہ پڑے گا)

☆ ایک دعوت میں مفتی صاحب کے ساتھ تھا، ندوہ کے کئی حضرات بھی اس میں مدعو تھے، ایک میز پر کھانا چن دیا گیا، اس موقع پر مفتی صاحب نے فرمایا کہ کھانے کی تین خصوصیات ہیں: (۱) کھانا لذیذ ہو (۲) جگہ بھی مناسب ہو (۳) ساتھ میں کھانے والے بھی سلیقہ مند ہوں۔

☆ مفتی صاحب کی سادگی ایسی ضرب المثل تھی، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے،

عہد اول کے لوگوں کے بارے میں سنا ہی نہیں، بلکہ پڑھا بھی ہے کہ ان کا لباس بڑا موٹا جھوٹا ہوتا، اور کھانا بھی عام وسادہ، یہ دونوں باتیں مفتی صاحب کا جزو زندگی تھیں، مطبخ کا عام کھانا مفتی صاحب بغیر کسی تکلف کے تناول فرمالیا کرتے تھے، اور لباس معمولی، بغیر پریس کئے ہوئے زیب تن فرماتے تھے۔

☆مفتی صاحب کی ایک صفت اہل مدارس کی خیر خواہی تھی، شہر لکھنؤ کے بعض مخیّرین مفتی صاحب کی تصدیق لازمی قرار دیتے، تو مفتی صاحب اس کے لئے علاقہ کے لوگوں سے رابطہ کرکے صحیح معلومات حاصل کرتے اور اہل خیر حضرات کے حوالہ کردیتے، وہ مفتی صاحب کی لسٹ کے مطابق عطیات وامداد عنایت فرماتے، ایک دفعہ مجھ سے بھی ایک علاقہ کے مدرسوں کی لسٹ مانگی اور پوری تحقیق کے بعد مرتب انداز میں اہل خیر حضرات کے سپرد کی۔

☆بعض وثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایک نئے مدرسہ کے ذمہ دار صاحب مفتی صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ مدرسہ میں بڑی پریشانیوں کا سامنا ہے، مفتی صاحب نے دریافت فرمایا: کتنی رقم کی ضرورت ہے؟ مفتی صاحب نے مسجل صاحب دار العلوم کو رقعہ لکھا کہ میرے حساب سے ان کو اتنی رقم دے دی جائے۔ جزی الله تعالی المفتی الجلیل خیر الجزاء، و أکرمه بالجنة والنعیم ۔

☆مسجد دار العلوم ندوۃ العلماء میں نکاح خوانی کا عمل عموما مفتی صاحب کے ذریعہ سے انجام پاتا، نکاح ایک عبادت ہے اور ذمہ داری بھی، بعض حضرات بغیر پیشگی اطلاع کے آجاتے تو مفتی صاحب ان کے مسئلہ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتے، فرماتے: ہر کام کو ضابطہ کے مطابق کرنا چاہئے، اہل تعلق جانتے ہیں کہ مفتی صاحب کی ’’نہیں‘‘ کو کوئی ’’ہاں‘‘ میں تبدیل نہیں کراسکتا تھا، نہ شور، نہ ہنگامہ، نہ ڈانٹ، نہ پھٹکار، خوش اسلوبی سے مفتی صاحب معاملہ حل فرماتے، اس موقع پر ان کی اصول پسندی دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ مفتی صاحب نکاح خوانی میں طول عمل کے قائل نہیں تھے، پہلے ولی یا وکیل سے

اجازت طلب کرتے، اور صاف الفاظ میں فرماتے کہ فلاں کی صاحبزادی نے آپ کو اپنا وکیل بنایا ہے کہ آپ فلاں صاحب کے لڑکے سے ان کا نکاح کرائیں، کیا آپ ہمیں اجازت دیتے ہیں؟ اجازت ملنے پر خطبۂ نکاح پڑھتے، اور ایجاب وقبول کراتے، عام طور پر ایک بار اور کبھی دو بار ایجاب وقبول کراتے، پھر فرماتے: نکاح ہوگیا، آیئے، خیر وبرکت کی دعاء کرلیجئے۔

عوام میں یہ عجیب بیماری ہے کہ وہ نماز میں ادنی سقم کو بطلان صلاۃ کا ذریعہ سمجھتے ہیں، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ نماز پڑھا رہے تھے، غلطی سے سورۂ والتین میں "الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلهم أجر غیر ممنون" میں صرف فلهم کی ’’ف‘‘ چھوٹ گئی تو ایک صاحب نے کہا کہ نماز نہیں ہوئی ۔(پرانے چراغ ج ۲/۱۹۷)۔ اس طرح عوام چھوٹے چھوٹے مسئلہ میں الجھ جاتے ہیں اور خود سے فیصلہ وفتوی بھی صادر کرنے لگتے ہیں، اور اپنی رائے کے مطابق مفتی حضرات کو مجبور کرتے ہیں، کئی بار ایسا ہوا کہ بعض ناواقف حضرات جو نماز کے مسائل سے واقف نہیں، خود سے نماز کے باطل ہونے کا فتوی صادر کرنے لگے، اور اس پر مفتی صاحب کو باصرار راضی کرنے لگے، مفتی صاحب نے اس موقع پر فرمایا کہ مسئلہ کچھ اور ہے، آپ مانیں یا نہ مانیں۔ اس طرح سوال کرنے والوں کو مفتی صاحب خاموش فرمادیتے۔ غرض بے پناہ خوبیوں کا انسان ہم سے رخصت ہوگیا، ان کی شفقتیں، عنایتیں اور توجہات برابر یاد رہیں گی۔

کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے، زباں سے زور بیاں گیا ہے

☆☆☆☆

کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسم وفا کی بات چلی

مولانا محمد اعظم ندوی

(استاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد)

کبھی سوچتا ہوں لوگ مفتی صاحبؒ سے ایسی بے پناہ محبت کیوں کرتے تھے! کچھ بھی تو ایسا نہ تھا ان کے پاس جو آج کی مادی دنیا کے لئے باعث کشش ہو، عیش فراواں اور سیم وزر کی بہتات جس کو آج ''قاضی الحاجات'' اور ''سو بات کی ایک بات'' سمجھا جاتا ہے، زرق برق لباس جو کسی کے صاحب ذوق اور نستعلیق ہونے کی علامت کے طور پر دیکھا جاتا ہے، شیریں زبانی اور طلاقت لسانی جو ملکۂ خداداد ہے خلق خدا کے دلوں پر حکم اور حکومت چلانے کے لئے، وفور جذبۂ تحریر کہ بائیو ڈاٹا میں ہر سال مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں کی فہرست شامل کی جائے، جاہ ومنصب کا تنوع کہ قومی اور ملی خدمات کی شہادت بن سکے، بین الاقوامی اور قومی سیمیناروں میں شرکت کا ریکارڈ کہ قدم زمین پر اور دماغ آسمان پر رہے، نہ سادگی میں پرکاری نہ تواضع میں غرور، نہ عبارت نہ اشارت نہ ادا، پھر بھی محبت ان سے، پھر بھی ان میں دل کشی، پھر بھی ان کے چرچے اور ان کا تذکرہ، ان کی یادیں اور ان کی باتیں، فقط استخواں پرستی اور پس مرگ ماتم نہیں، زندگی میں بھی، اور ان کے جیتے جاگتے بھی تو یہی کیفیت تھی کہ

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں

شاید وہ بات جو سو بات پر بھاری تھی وہ ان کی بے ریا کسر نفسی تھی، ان کی تصنع سے پاک خوش مزاجی تھی، ان کا وہ علم تھا جو طوطی وبلبل کی طرح رٹا ہوا نہیں، شعور وآگہی اور بصیرت کے ساتھ سمجھا ہوا تھا، جس میں مواد کی کمی کو الفاظ کے زور سے اور الفاظ کی کمی کو

آواز کی گھن گرج سے دور کرنے کا شائبہ تک نہ تھا، جو کوئی متاع کوچۂ وبازار نہ تھا کہ ہر جگہ اس کی نمائش ہو اور ہر نظر اس کی طرف خریدار کی طرح اٹھے، وہ علم تھا جو کبھی دوران تدریس سہل بیانی میں ڈھل جاتا، اور کبھی فتوی میں سہل نگاری کا قالب اختیار کر لیتا، وہ علم جس کی نشر واشاعت کے لئے اسٹیج تیار نہیں کیا گیا، مسند وغالیچے نہیں بچھائے گئے، اکیڈمی نہیں بنائی گئی، ویب سائٹ نہیں تیار کی گئی، اور سوشل میڈیا پر اس کے لئے گروپ بندی نہیں کی گئی، وہ کبھی شاید آن لائن نہیں ہوئے لیکن ان سے کچھ پانے کے لئے تشنہ گان علم ہمیشہ لائن میں لگے رہے۔

عہدوں کو دیکھئے تو ان کا تعلق ندوہ سے تھا، جس سے انتساب خود ایک عہد ہے جس سے عہدہ برآ ہونا اصل امتحان کا میدان ہے، عالم اسلام کا دھڑکتا ہوا دل، سوچتا سمجھتا ہوا روشن دماغ، حرکت ونمو سے لبریز جسم، ٹوٹے دلوں کو جوڑنے اور روٹھے ہوؤں کو منانے کے لئے ایک بے تاب طبیعت کی حامل تحریک، آسمان علم وادب کا ایک روشن ستارہ، بھرپور ماضی اور کامیاب حال رکھنے والا اور، اور درخشاں مستقبل کی طرف رواں دواں ایک عظیم ادارہ اگر ندوہ نہیں تو کون ہے؟ اور مفتی صاحبؒ کا اس ادارہ سے انتساب کون نہیں جانتا کتنی حیثیتوں سے رہا، اور اونچی اونچی کرسیوں سے رہا، لیکن طالب علمانہ شان سے قلمدان تک کے سفر میں کبھی کسی نے مفتی صاحبؒ کے مزاج میں ادنی فرق دیکھا! مسجد اور کینٹین میں بیٹھے بیٹھے دستخط مل جائیں، راہ چلتے ہوئے فتوے مل جائیں، اور کبھی یہ نہ سننا پڑے کہ کل میرے آفس میں ملنا، سادگی نہیں تو اور کیا ہے، ہم تو اپنی خودساختہ کٹیا میں ایک عدد لیپ ٹاپ رکھ کر اسے آفس کہتے ہیں، کوئی نہیں جانتا تو اس کی تصویریں جام وسبو کی طرح گردش میں لاتے ہیں لیکن کل کی طرح آج بھی بے ہنر اور بے فیض ہیں، یہ اور بات ہے کہ اپنے عیب کو ہنر اور قصور علم کو مکتبہ شاملہ اور انٹرنیٹ کا منہ دیکھ کر وفور علم کہتے ہیں لیکن وہاں میز وکرسی، جھاڑ وفانوس، پردہ وپاپوش، چائے دان اور قلم دان سے سجے سجائے

دفاتر حوالے کئے گئے، مفتی صاحبؒ کبھی ان بیساکھیوں کے سہارے نہ چلے، لیکن ان کی خصوصیت تھی کہ وہ چلے تو سب چلتے رہے، کوئی قدم ان کو دیکھ کر رکا نہیں، کسی کی رفتار دھیمی نہیں ہوئی، کوئی نہ ڈرا نہ سہا، قافلہ سالار تو وہی ہے کہ وہ چلے تو سب چلیں، نہ کہ وہ اور اس کے تین نفری قافلے کے لئے انسانی قافلے روک دیئے جائیں۔

یاد آتا ہے کہ جس سال ۱۹۹۹ء میں ندوہ آیا، والد صاحب سفر حج کے لئے جا رہے تھے، معمول کے مطابق گھر جانا تھا، چھٹی کے لئے مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا تھا، استاذ محترم حضرۃ الاستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی صاحب دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی بے انتہا شفقتیں کسی نہ کسی درجہ میں اس وقت بھی حاصل تھیں لیکن رعب مانع ہوتا تھا، مہتمم صاحب اسی دوران کسی علمی سفر پر روانہ ہوئے، میں نے سوچا اس سے بہتر چھٹی لینے کا موقع نہیں ملے گا، مغرب کے بعد مفتی صاحبؒ دارالعلوم کے پاس سے گذر رہے تھے، میں مغرب بعد سے تاک میں تو تھا ہی، درخواست جیب میں تھی، پہلا تجربہ تھا اس لئے ڈر تو ان سے بھی لگا لیکن درخواست بڑھا دی، مفتی صاحب نے فرمایا ہسپتال میں دیکھو ڈاکٹر ہیں اور درخواست رکھ لی، میں نے سمجھا کام ہوگیا، کام جو کر رہے ہیں شیخ کا، کچھ نہ کچھ تو مراعات ملے گی، واپس آکر خبر دی، یاد نہیں کیا کہا: ڈاکٹر ہے یا نہیں، پھر بے تکلف بات بھی کرتے رہے، بہر حال جب ہم اپنے اصل موضوع پر آئے، اور مفتی صاحب سے بڑی آس تھی کہ تین دن سے زیادہ تو ضرور چھٹی مل جائے گی، بہت کچھ منت سماجت کی، مفتی صاحب نے صرف اتنا لکھ دیا: ''حسب ضابطہ رخصت منظور ہے'' اور دستخط کر دیئے، میں نے دل میں سوچا بڑے میاں کو جتنا ''بے ضابطہ'' سمجھنے کی گستاخی کی وہ اسی قدر انتہائی ''باضابطہ'' نکلے۔

جامعہ سید احمد شہیدؒ، کٹولی لکھنؤ میں تدریس کے ساتھ فتوی نویسی کا کام بھی کرتا تھا، ایک مسئلہ میں تصویب کے لئے حاضر ہوا، جیل میں جمعہ کا مسئلہ تھا، جس کو بہت سے اہل علم نے اذن عام کی یک گونہ کیفیت پائے جانے کی وجہ سے جائز کہا ہے، چونکہ اس کے دروازہ

کا بند ہونا اس کی انتظامی ضرورت سے ہے، میں نے بھی جائز لکھا تھا، اپنے محبوب استاذ، مربی اور محسن و کرم فرما حضرت مولانا نیاز احمد ندوی زید مجدہ سے بھی مشورہ کر رکھا تھا، اور آپ نے اس کے دعوتی اور تعلیمی فوائد کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تائید فرمائی تھی جو میرے لئے ایک سند تھی، لیکن مفتی صاحبؒ یہاں بھی ''باضابطہ'' نظر آئے کہ اذن عام ثابت کرو، تو تصویب کر دیں، میں الٹے پاؤں واپس ہوا کہ مفتی صاحب کو قائل کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں، یہ رائے علم و مطالعہ کے بعد بنتی ہے جو آسانی سے بدلتی نہیں، ایک بار کہنے لگے: جدید تجارتی اسکیموں اور نیٹ ورک مارکیٹنگ وغیرہ سے متعلق کوئی سوال پوچھتا ہے تو پہلے میں اسے ناجائز ہی سمجھتا ہوں پھر سائل کی تشفی کے لئے اس کی بات سن لیتا ہوں لیکن بات عام طور پر وہی ہوتی ہے جو میں سوچتا ہوں، دراصل مفت میں مال نہیں ملتا، اور یہ تو خود بھوکے ہیں تم کو کیا دیں گے جو ہے وہ بھی تمہاری جیبوں سے نکال لیں گے، میں نے مفتی صاحب سے ہدایہ رابع، اور تبصرۃ الحکام اول و دوم پڑھی ہیں، ہم لوگ قال اقول میں لگے رہتے اور ضمیر کا مرجع تلاش کرتے رہتے، مفتی صاحب دو لفظ میں اپنی بات کہہ دیتے، بعض طلبہ کہتے: مفتی صاحب حاشیہ میں تو ایسا لکھا ہے تو کہتے ایسا لکھا نہیں تم نے ایسا سمجھا ہے، اور واقعی پورا حاشیہ سمجھ کر پڑھا جاتا تو تو اپنا جہل عیاں ہوتا، سچ مچ زندگی میں ہم لوگ بڑوں کی قدر نہیں کرتے، کبھی اہتمام سے جا کر ان سے ملنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی، لیکن آج جب حساب کرتا ہوں اپنے گزرے ہوئے ماہ و سال کا تو پشیمانی ساتھ نہیں چھوڑتی، اور یاد کرتا ہوں بیتے ہوئے دنوں کو تو مفتی صاحبؒ کی قدر آتی ہے۔

عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے
کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

مفتی صاحب کا نام ظہور تھا لیکن ''ظہور'' فطری طور پر ان کو پسند نہ تھا، اللہ نے

ان کو ظاہر کیا اور ان کو ظاہری اور معنوی عظمت عطا کی، آپ کی زندگی میں تین خصوصیات ہمیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں:

۱۔ اختصاص: مفتی صاحب کا اختصاص فقہ میں تھا، اور انہوں نے خود کو اسی سے مربوط رکھا، ذوق عالمگیریت میں اس سے باہر قدم نہیں رکھا، اور اسی لئے ان کے فتوے بہت جچے تلے ہوتے تھے، اور زبان و بیان کی روانی اور شفافیت دوچند ہے، گو کہ مفتی صاحب نے حدیث کی بھی بعض کتابیں طحاوی وغیرہ پڑھائیں لیکن میری معلومات میں آپ کا تدریسی موضوع بھی بیشتر یہی رہا۔

۲۔ سادگی جس میں خلوص وللّٰہیت کا عکس صاف نظر آتا تھا۔

۳۔ جذبۂ وفا کہ ندوہ میں جب سے آئے یہیں کے ہوکر رہ گئے، اور المعہد العالی للقضاء والافتاء کی صدارت کے ساتھ ساتھ نائب مہتمم سے نائب ناظم تک کے عہدہ پہ آئے لیکن جلوہ افروزی کی صفت کبھی دیکھنے میں نہیں آئی اور رونق بزم کے عنوان سے بھی کم کسی جلسہ میں آئے، وقف کر دیا خود کو ندوہ کے کاموں کے لئے اور یہی ان کی دلچسپی کا موضوع بن گیا، مولانا عبد اللہ عباس ندویؒ، مولانا برجیس صاحبؒ، مولانا شفیق الرحمٰن ندویؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ، شیخ ناصر علی ندویؒ، مولانا محمد عارف سنبھلیؒ، مولانا محمود الازہار ندویؒ، مولانا ابراہیم رودولوی ندویؒ، مولانا طارق صاحب ندویؒ، مخدوم ومربی مولانا عبد اللہ محمد الحسنیؒ، انگریزی کے اساتذہ میں جناب امین الدین شجاع الدین صاحبؒ، ماسٹر لطیف صاحبؒ، ماسٹر داؤد صاحب اور نہ جانے کیسے کیسے علم وادب کے آفتاب وماہتاب کو ان گنہ گار آنکھوں نے دیکھا اور ان سے فیض اٹھایا جو ''تالیف نسخہ ہائے وفا'' کا عمل انجام دے گئے، افسوس کہ اب اس دنیا میں نہیں رہے اور اب مفتی صاحبؒ کا نام بھی اسی فہرست میں لکھنا پڑ رہا ہے، اگر کوئی ایک صفت ان سب میں یکساں تھی تو وہ یہی جذبۂ وفا ہے، اف کیا لوگ تھے جو اس راہ محبت سے گذرے اور اپنے نقوش دلوں پر ثبت کر گئے۔

کیسے کیسے لوگ تھے جن سے رسم وفا کی بات چلی

مفتی صاحبؒ: کچھ یادیں کچھ باتیں

محمد شاہد اعظمی (تدریب افتاء، دار العلوم ندوۃ العلماء)

راقم ۲۰۰۹ء میں عظیم الشان عالمی درسگاہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوا، ابتداء میں راقم کا مفتی صاحب سے کوئی ربط وتعلق نہ تھا، اور نہ ہی مفتی صاحب کی عظیم شخصیت سے واقف تھا، لیکن جلد ہی مفتی صاحب سے تعارف کی مناسبت ہوگئی، اور یہ مناسبت محبت میں تبدیل ہوگئی، اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ مفتی صاحب راقم کے ہم وطن تھے، ان دنوں مفتی صاحب سہارے سے چل پھر لیتے تھے اور بڑی پابندی کے ساتھ نماز پنج گانہ کے لئے پہلی صف کا اہتمام فرماتے تھے، میں نے بارہا دیکھا کہ مفتی صاحب فجر کی سنتوں اور فرض کے درمیان مسلسل نماز ہی پڑھتے تھے، لہٰذا راقم نے عرض کیا مفتی صاحب یہ کون سی نمازیں ہیں، تو مفتی صاحب نے فرمایا کہ قضاء عمری پڑھ رہا ہوں۔

مفتی صاحب کی بہت سی خصوصیات میں یہ بھی تھی کہ جو بھی عمل کرتے اس میں تسلسل و دوام پایا جاتا تھا، گویا ''خیر الاعمال ادومہا و ان قل'' کی عملی تصویر تھے، مفتی صاحب کا دوسرا اہم وصف ان کی علوم شرعیہ میں گہری نظر اور اس میں مہارت تامہ تھی، راقم کو مفتی صاحب سے خصوصی طور سے قدوری، ہدایہ، سراجی، نزہۃ النظر، جیسی اہم کتابیں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، چارپائی پر لیتے رہتے آنکھ بند رہتی اور مسئلہ سمجھاتے رہتے، اور راقم عبارت بڑھ دیتا، جب بھی کوئی مسئلہ ہدایہ کا سمجھ میں نہ آتا، تو wheel chear کو چلاتے چلاتے پوچھ لیتا، مفتی صاحب بڑی آسانی کے ساتھ مسئلہ سمجھا دیتے، مفتی صاحب کا صحت کے زمانے میں ہمیشہ تلاوت کلام اللہ کا معمول تھا، خاص طور سے سورۃ الکہف جمع سے پہلے ضرور پڑھتے تھے۔

مفتی صاحب بحیثیت مربی:

مفتی صاحب ایک قابل قدر مربی بھی تھے، جب کسی طرح کی کوئی نامناسب بات دیکھتے تو فرماتے کہ اس سے احتراز کرنا چاہئے، راقم نے مفتی صاحب کا یہ معمول دیکھا کہ جب کوئی نامناسب بات دیکھتے تو اس کی اصلاح کا یہ طریقہ اختیار کرتے کہ یہ کام نہیں کرنا چاہئے، یہ نہ مناسب کام ہے، برجستہ نہ ٹوکتے، آپ کے لہجے میں تواضع و انکساری پائی جاتی تھی، جبراً یا حکماً کسی بات کو نہ منواتے بلکہ عاجزانہ پہلو اختیار کرتے۔

مفتی صاحب فرماتے کہ ایک مسلمان کو استغناء اختیار کرنا چاہئے، اور دنیا کی چیزوں کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہئے، قناعت اختیار کرنا چاہئے، مفتی صاحب اپنا ایک واقعہ بھی سناتے تھے کہ جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی کہ یا اللہ کبھی کسی کا دست نگر ومحتاج نہ بنانا، اس دعا کے بارے میں فرماتے کہ میں پوری زندگی کبھی بھی مالی تنگی سے دوچار نہیں ہوا۔

مفتی صاحب بحیثیت استاذ:

راقم نے مفتی صاحب کو ہمیشہ دیکھا کہ جب ان کا گھنٹہ علیا اولیٰ میں تبصرۃ الاحکام کا ہوتا تو اس کا مطالعہ فرماتے تھے، اور جب مفتی صاحب سے کوئی مسئلہ پوچھتا یا اس میں تحقیق کرتا تو مفتی صاحب ایسے سمجھاتے گویا کہ مفتی صاحب کے سامنے لکھا ہوا موجود ہے، مفتی صاحب متقدمین کی رائے کو راجح قرار دیتے تھے، راقم نے مفتی صاحب سے معلوم کیا کہ آپ نے بخاری شریف پڑھایا ہے؟ تو مفتی صاحب نے کہا کہ جی ہاں ایک زمانے میں میں نے بخاری کا بھی درس دیا ہے۔ مفتی صاحب اپنے استاذ محترم شیخ حلیم عطاء صاحب کا بھی تذکرہ کیا کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ انہیں پوری بخاری شریف ازبر یاد تھی، اور اپنے استاذ مولانا عبدالحفیظ بلیاوی صاحب کا بھی تذکرہ کرتے ہوئے کہتے کہ موصوف اپنا سارا کام خود ہی انجام دیتے تھے، یہاں تک کہ اپنا کپڑا بھی خود سے سی لیتے تھے۔ مفتی صاحب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ کثرت سے سناتے تھے

کہ جب مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی کام لینا ہوتا تو فرماتے کہ مفتی صاحب یہ کام آپ کے ذمے ہے، یہ کام آپ ہی کرسکتے ہیں، کوئی آپ کے علاوہ نہیں کرسکتا، مفتی صاحب کو راقم نے بارہا دیکھا کہ جب عصا کے سہارے چل پھر لیتے تھے تو گھر کے کام خود کر لیتے تھے۔ مفتی صاحب دوپہر میں صرف لیٹ جاتے وہ بھی بہت مختصر، راقم نے کہا مفتی صاحب آپ قیلولہ نہیں فرماتے تو فرمایا کہ لوگ دور دراز سے مسئلے کے لئے آتے ہیں، اگر میں قیلولہ کرونگا تو لوگوں کو زحمت ہوگی، مفتی صاحب کا مزاج تھا کہ جب بھی کوئی مسئلے کیلئے آتا تو اطمینان کے ساتھ جواب دیتے، طبیعت پر ذرا بھی بار نہ محسوس ہوتا۔

مفتی صاحب کی اہم خدمات:

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ۱۹۹۹ء کی ایک رات جب رواق اطہر میں پولیس کی طرف سے فائرنگ اور طلباء کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، تو مفتی صاحب صحت مند تھے، مفتی صاحب فرماتے تھے کہ جب انہیں گولی کی آواز سنائی دی اس وقت وہ گھر سے باہر آئے رواق اطہر کی طرف بڑھے، جہاں پولیس والے موجود تھے، جب مفتی صاحب آگے بڑھے تو پولیس والوں نے کہا کہ آگے نہ بڑھئے ورنہ گولی ماردی جائے گی، لیکن مفتی صاحب بے خوف خطر آگے بڑھتے چلے گئے اور موت سے ذرا بھی نہ گھبرائے اور جاکر طلباء کی خیریت لی، راقم نے مفتی صاحب سے پوچھا آپ کو ڈر نہ لگا، تو مفتی صاحب نے کہا کہ موت سے کیا ڈرنا وہ تو برحق ہے، اور مرنا تو ایک ہی بار ہے۔

دوسرا واقعہ مفتی صاحب یہ سناتے تھے کہ ایک بار حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ یہاں کے انتظام وانصرام سے غصہ ہوکر چلے گئے، اور کسی طرح ندوہ آنے پر آمادہ نہ تھے، آپ اپنے وطن رائے بریلی میں پناہ گزیں تھے، چنانچہ مفتی صاحب وہاں گئے اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے ایسی لجاجت سے درخواست پیش کی کہ مولانا نے قبول فرما لیا اور ندوہ تشریف لے آئے۔

مفتی صاحب اپنی پیرانہ سالی ومعذوری کے باوجود...... **باقی ۸۴ ص پر**

حضرت مفتیؒ صاحب کا جامعہ ام الخیر سے تعلق

مناظر الاسلام حسنی ندوی
(ناظم جامعہ ام الخیر نسواں)

ہم سبھوں کے استاذ محترم اور ندوۃ العلماء کے مؤقر نائب ناظم حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندوی رحمۃ اللہ علیہ بلاشبہ عظیم شخصیت کے مالک تھے، تدریس، افتاء اور انتظام وانصرام کے لحاظ جو کارہائے نمایاں انجام دیا وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، آپ کا سب سے بڑا سرمایہ آپ کے تلامذہ ہیں جو پوری دنیا میں دین وعلم کی اشاعت میں مصروف ہیں، اسی طرح جن اداروں کو آپ کی ذات سے فیض پہونچا، وہ بھی آپ کے لئے اجر وثواب کا ذریعہ ہیں۔

آپ کا ایک وصف دین اور علم دین کی اشاعت میں مصروف کارکنان کی حوصلہ افزائی کرنا تھا، دین سے متعلق ہر چھوٹے بڑے کام کو آپ خاص اہمیت دیتے، اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، چند سال قبل ہم چند احباب نے ملکر جامعہ ام الخیر نسواں کے نام سے لڑکیوں کا ایک ادارہ قائم کیا، تو دیگر اساتذہ کی طرح آپ کو بھی اس کی اطلاع دی اور دعا کی درخواست دی، مفتی صاحب نے یہ سن کر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور اخلاص کے ساتھ جمے رہنے کی تلقین کی۔

جامعہ ام الخیر ابھی ابتدائی مرحلہ میں تھا، اور کرایہ کی عمارت میں تعلیم ہو رہی تھی، اس وقت ہم سب کی خواہش ہوئی کہ مفتی صاحب کو اپنی ٹوٹی پھوٹی کوشش دکھانا چاہیے، تاکہ اس بارے میں آپ کے مشوروں سے مستفید ہوسکیں، چنانچہ مفتی صاحب کو یہاں آنے کی دعوت دی، آپ تشریف لائے، اس مناسبت سے سید صغیر رضوی مرحوم اور ان کی اہلیہ طاہرہ رضوی موجود تھیں، حسب معمول طالبات نے اپنا تعلیمی مظاہرہ پیش کیا، ان حضرات نے طلبہ کی تعلیمی سرگرمی کو سراہا اور مزید محنت کرتے رہنے کو کہا، اس پروگرام میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ ایک طالبہ نے موت کے موضوع پر تقریر کی، طاہرہ رضوی نے یہ کہہ کر بچی کو

تقریر جاری رکھنے سے روک دیا کہ ان کے شوہر دل کے مریض ہیں، ان پر اس کا اثر پڑے گا، مفتی صاحب نے محترمہ کے مشورہ کو قبول نہیں کیا، اور طالبہ سے تقریر جاری رکھنے کو کہا، حالانکہ صغیر رضوی مرحوم سے مفتی صاحب کے بڑے اچھے تعلقات تھے، اور یہی نہیں بلکہ خود مفتی صاحب نے اپنی صدارتی تقریر بھی موت کے موضوع پر کی۔

جب جامعہ اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوا تو متعدد بار مفتی صاحب کو ہم لوگوں نے زحمت دی، اور ہر بار آپ تشریف لائے، ایک مرتبہ مفتی صاحب اور امین الدین شجاع الدین مرحوم دونوں ساتھ تشریف لائے، اس موقع پر بچیوں سے ایک خاص بات کہی جواب بھی یاد ہے، آپ نے بچیوں سے مخاطب ہوکر کہا بچیوں! یہ بتاؤ کہ چند سال قبل لڑکے اپنی ماؤں سے یہ کہتے تھے کہ اس کے لئے عالمہ لڑکی تلاش کریں، لیکن اب کہتے ہیں کہ جس سے رشتہ کی بات چل رہی ہے وہ عالمہ تو نہیں، میں تم لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوگیا ہے، مفتی صاحب کا یہ احساس یقیناً بہت اہم تھا۔

اسی طرح جامعہ کے سالانہ جلسہ میں بھی ہم لوگوں نے مفتی صاحب کو زحمت دی اور آپ تشریف لائے، مروہ فاؤنڈیشن کی طرف سے سردیوں میں شال اور کمبل تقسیم کرنے کا پروگرام ہوتا ہے، اس مناسبت سے بھی آپ تشریف لائے، اور فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں سے واقف ہوئے، اس طرح متعدد مواقع پر آپ یہاں تشریف لاتے رہے اور ہم کارکنان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہے، اکثر ملاقاتوں میں آپ توکل کی بات کہتے، آپ فرماتے کہ دوسروں پر یقین کرنے سے بہتر ہے کہ اللہ پر یقین کیجئے، دوسروں سے مانگنے سے بہتر ہے کہ اللہ سے لو لگائیے، ان سے مانگئے۔

مفتی صاحب یقیناً اس دنیا سے رخصت سے ہوگئے، مگر اپنے پیچھے اتنی یادیں چھوڑ گئے کہ انکی باتیں اور ان کا انداز مدتوں یاد آئے گا، واقعی اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں، بندگان خاص کی یہی صفت ہے، اللہ تعالی استاذ محترم کو جنت الفردوس میں بلند درجات عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے لئے صدیقہ جاریہ بنائے۔ آمین

مفتی صاحبؒ اور رشید سید احمدؒ

ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری ام ہانی

ہر ذی روح جو دنیا میں آئی ہے، جسے اللہ تعالی نے زندگی سے نوازا ہے اسے موت بھی آنی ہے، لیکن چند ہستیوں کو اللہ تعالی نے ایسے اوصاف سے نوازا ہوتا ہے جس سے دوسرے انسانوں کو اور سماج کو بہت کچھ فائدے پہونچتے ہیں، اور ان کی شخصیت دلوں میں ایک دائمی اثر چھوڑ جاتی ہے، اور ان کی کمی ہمیشہ محسوس ہوتی ہے۔

انہی شخصیات میں مفتی محمد ظہور ندویؒ کا بھی شمار ہوتا ہے، میں ان کے بارے میں بہت زیادہ نہیں جانتی تھی، لیکن ۱۹۸۰ء سے جب میں اپنی پی ایچ ڈی کے سلسلہ میں ندوۃ العلماء کے کتب خانہ سے استفادہ کرنے جایا کرتی تھی تو ان کے متعلق سنا کرتی تھی۔

پھر ۱۹۹۴ء میں جب جناب رشید سید احمد بن سید صدیق حسن صاحب سے میرا نکاح ہوا تو ان کے ساتھ مفتی صاحب کے گھر آنا جانا رہا، رشید صاحب کی کمپنی الفلاح میوچول بینیفٹس Al Falah Mutual Benefits کے ڈائرکٹرس میں بھی مفتی صاحب شامل تھے، اور وقتاً فوقتاً میرے غریب خانہ Laxmi Bai Marg Hazratganj تشریف لایا کرتے تھے، اور میں اپنے بیٹے اسحاق عمر احمد کو ان کے پاس بھیج کر اس کے لئے دعاؤں کی درخواست کیا کرتی تھی، مفتی صاحب بڑی شفقت ومحبت سے میرے لڑکے کو اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرتے، سمجھاتے اور دعائیں دیتے تھے۔

میرا بیٹا گھر میں دوسرے افراد خاندان کے بچوں کی یوم پیدائش (برتھ ڈے) کو دیکھتا کہ کیک کٹ رہا ہے، مہمان آرہے ہیں، اور رنگین کاغذوں میں لپٹے ہوئے تحائف آرہے ہیں تو وہ بھی ضد کرتا کہ میری بھی سالگرہ مناؤ، میں نے یہ ترکیب نکالی کہ جب ان کا ایک پارہ قرآن ختم ہوتا تو بچوں کی دعوت کرتی اور تحفے تحائف دیتی،

ماہنامہ صدائے مروہ لکھنؤ

اس موقع پر مفتی صاحب کو دعوت دی جاتی آپ تشریف لاتے، بچوں کو دعاؤں سے نوازیں، اور اس سے کچھ آیتیں سن کر ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

میرا جب بھی ندوہ جانا ہوتا تو میں ان کے گھر ضرور جاتی اور کافی دیر تک رہتی، رشید صاحب مجلس تحقیقات ونشریات میں کئی کئی گھنٹے مصروف رہتے اور میں مفتی صاحب کی اہلیہ کے پاس بیٹھی رہتی، نمازوں کے وقت ہم ساتھ نماز پڑھتے۔ چائے، کھجور، اور مختلف ناشتے کے سامان سے لطف اندوز ہوتی۔ گھر میں بے حد سادگی اور روحانیت کا دور دورہ محسوس ہوتا تھا، بہت خلوص ومحبت سے میری پذیرائی کی جاتی تھی، اور گفتگو کے دوران ان کی اہلیہ کے تجربات زندگی سے بھی بہت کچھ سیکھنے کو ملتا، اللہ تعالی ان دونوں کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

میرے والد پدم شری مقبول احمد لاری کا انتقال پرملال مئی ۲۰۰۴ء میں ہوا، ظہر کے وقت ان کی نماز جنازہ ہوئی، جسے مفتی صاحب نے ہی پڑھائی تھی، اللہ تعالی انہیں اس کے لئے اجر عظیم عطا فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بقیہ ص ۸۰: نماز پابندی کے ساتھ ادا فرماتے تھے، عصر کی نماز کے بعد جب راقم موصوف کو اساتذہ سے ملاقات کیلئے لاتا تو جب مغرب کی اذان ہونے لگتی اور راقم گھر جانے کو کہتا تو فرماتے کہ لوگ مسجد کو جارہے ہیں اور میں گھر کو جارہا ہوں، اور بہت افسوس کا اظہار فرماتے اور کہتے کہ مجھے اسی طرح اٹھا کر مسجد لے چلو، راقم عرض کرتا کہ آپ معذور ہیں، اور آنے جانے میں کافی دشواری ہوگی، تو پھر سکوت فرماتے، اور عذر کی وجہ سے مسجد میں نماز نہ ادا کرنے کا غم انہیں بہت ستاتا تھا، اور لوگوں سے اس کا اظہار بھی فرماتے تھے۔☆☆☆☆

ستمبر و اکتوبر ۲۰۱۶ء

نقوش ظہور

حضرت مفتی صاحبؒ کی تحریریں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مولانا مفتی محمد ظہور صاحب ندوی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کیا تھے؟ ایسی جامع شخصیت کے بارے میں کیا کیا عرض کیا جائے، جو لکھا جائے وہ کم ہے، مرجع خاص و عام، بلند پایہ، امت اسلامیہ کا سرمایہ، پیکر خلوص و وفاء، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مسلم بلا اختلاف صدر نشین، بے شمار اداروں کے رکن رکین، آکسفورڈ یونیورسٹی کی مجلس اسلامی کے سربراہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی مجلس شوریٰ کے ممبر، رابطہ عالم اسلامی کے دائمی ممبر، دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سرپرست، علم و ادب کے شہسوار، عالمگیر شہرت کے مالک، علم و تقویٰ کے لحاظ سے مینارۂ نور، ان کے دم سے ہم جیسے گنہگاروں کی عزت و آبرو قائم تھی، ان کی ایک ایک شفقت و محبت یاد آتی ہے، جب ان کی یاد آتی ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے، بے ساختہ آنکھیں اپنا قیمتی سرمایہ نذر کر دینا شروع کر دیتی ہیں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ حضرت مولانا ندوۃ العلماء کے معاملات سے دل برداشتہ ہو گئے تھے، اور قطعی علیٰحدگی کا فیصلہ کر لیا تھا، بس قسم تو نہیں کھائی تھی لیکن فیصلہ کچھ اسی طرح کا تھا، سب حضرات مولانا کو راضی کرنے سے مایوس ہو گئے تھے، لیکن اللہ کے یہاں مایوسی کفر ہے، راقم الحروف اساتذہ کی ایک جماعت لے کر رائے بریلی حاضر ہوا، مسجد میں حضرت سے بات ہونے لگی، اللہ کے گھر کی برکت تھی کہ بات بن گئی، میں نے عرض کیا کہ ہم سب تو آپ کے ساتھ دارالعلوم سے وابستہ ہیں، جب آپ ہی نہ ہوں گے تو ہم سب کیا رہیں گے، دارالعلوم یوں ہی بکھر جائے گا، حضرت کا دل آئینہ کی

طرح صاف شفاف تھا، کسی چیز کو ٹوٹتا اور بکھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا، اور نہ اس کو برداشت کر سکتا تھا، راضی ہو گئے، اتنی خوشی ہوئی کہ اس کی حلاوت آج بھی محسوس ہوتی ہے، غور تو فرمائیے کہ جس ذات کی علیٰحدگی وقتی طور پر دار العلوم سے گوارہ نہیں تھی وہ ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی، اس پر صبر محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے۔

قدیم وجدید کا ایسا حسین امتزاج، ندوۃ العلما کے تخیل کا زندہ جاوید پیکر، کبھی عرب کو آواز دے رہا ہے، ان کو قومیت کے جال سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اور کبھی عجم میں آواز لگا رہا ہے، نئے نئے اچھوتے اسلوب میں اسلامی افکار وخیالات اور تعلیمات کو پیش کر رہا ہے، اپنا دل نکال کر رکھ دیتا ہے، دل سے نکلی بات دل پر اثر رکھتی ہے، مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان سنائی، دنیا پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی، صرف داستان ہی سنانا نہیں تھا بلکہ تاریخ دعوت وعزیمت لکھ کر عروج واصلاح حال کی طرف رہنمائی بھی فرمائی، آہ! حضرت مولانا ملت کیلئے سرمایۂ حیات تھے، ہر خاص وعام کیلئے جائے پناہ تھے، سادگی ان کا شیوہ تھا، عزم واستقلال کے پہاڑ تھے، ان کی رفعت شان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا، زاہد بے ریا تھے، ہر مکتب فکر کیلئے وہ قابل قبول اور محترم تھے، مسلکی اختلاف کو مٹایا، امن واتحاد، پیام انسانیت جس کی ہندوستان جیسے ملک میں بے حد ضرورت تھی اس کی بنیاد ڈالی اور ایک جماعت کو اس پر لگا دیا، باطل سے، زمانہ کے فتنہ سے مقابلہ کیا اور خوب کیا، غیروں کو منہ کی کھانی پڑی، فتنوں کے روک کے لئے آپ کی ذات ایک قابل قدر ہستی تھی، ایک پشتہ تھی، روک تھی، سیل بیکراں کیلئے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے ہند کے مسلمانوں کی حفاظت فرماتا رہے، حضرت نے جو علمی ذخیرہ چھوڑا ہے وہ ایک فرد کا کام نہیں وہ ایک اکاڈیمی کا کام ہے، اس پر حیرت ہے کہ یہ یکسوئی میں کام نہیں کیا گیا ہے، یہ ایسے شخص کا کام ہے جو کثرت سے سفر کرتا رہا ہو، مختلف تنظیموں کے جلسہ وجلوس میں بھی شرکت کرتا رہا ہو، عرب وعجم

میں حضر سے زیادہ سفر پر رہا ہو اور مختلف النوع ذمہ داریوں کو بھی ادا کرتا رہا ہو، جو انتظامی بھی ہوں اور نجی وواقعاتی بھی ہوں، بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ آیۃ من آیات اللہ، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے اوقات میں بڑی برکت عطا فرماتا ہے۔

بلاشبہ حضرت کا تاریخی مطالعہ، تاریخی تجزیہ واستنتاج، اقوام وملل کا تقابلی مطالعہ، قوموں کے عروج وزوال سے گہری واقفیت، کسی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، اسی طرح تفسیری مطالعہ، قرآن کا موجودہ دور کی تحقیقات سے ربط واعجاز کے تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، عرب اور اس کے متعلقات سے ذوق وجدان کے فطری تعلق سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ سب ذیلی عنوانات ہیں، اصل چیز جو حضرت کو ان سب سے ممتاز کرتی ہے وہ حضرت کا اخلاص، سوز دروں، للّٰہیت، زخم ہائے دل ودرد دل، صدق ووفا، مضطرب وحساس دل، امت کے ہر غم کو اپنا غم سمجھ لینا، اتباع سنت، عشق رسول، اس کی روشنی میں حضرت کی تحریروں اور تقریروں کا جائزہ لیجئے، اور اس سے استفادہ کیجئے، اور ہو سکے تو اس گنہ گار کو بھی یاد کر لیجئے، آپ کی دعا بندہ عاجز کے لئے زادراہ ہوگی۔ (تعمیر حیات، مفکر اسلام نمبر)

کتابوں کی تصنیف کی بجائے افرادکی تصنیف

آپ نے کتابوں کی تصنیف کے بجائے افراد کی تصنیف پر اصل توجہ مرکوز رکھی، یہی آپ کا میدان رہا ہے، آپ نے ہزاروں جویائے علم کو سیراب کیا، طالبان علوم نبوت نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق اس چشمہ صافی سے فائدہ اٹھایا، اور آج مختلف حیثیتوں سے دین اور ملک وملت کی بہترین خدمت انجام دے رہے ہیں، یہ سب آپ کے منت کش اور ممنون ہیں اور آپ کے صدقہ جاریہ ہیں، اس طرح کئی نسلوں کی تعلیم وتربیت آپ کی وہ عظیم خدمت ہے، جو ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

ماخوذ از سپاس نامہ

کچھ مولانا ناصر صاحبؒ کے بارے میں

مولانا مفتی ظہور ندوی

مولانا کی تاریخ پیدائش ۱۹۳۳ء ہے، وفات کی تاریخ یکم جون ۲۰۰۷ء بروز جمعہ ہے، اس طرح ان کی عمر مبارک ۷۴ سال ہوئی، مولانا کی جائے پیدائش خرم نگر (مضافات لکھنؤ) ہے، خرم نگر میرا جانا ہوتا تھا، ایک روز رات میں میرا قیام ہوا، میں نے مولانا سے پوچھا کہ آپ کو دیہات میں خالص دودھ ملتا ہوگا اور دیسی انڈے بھی آپ لوگ کھاتے ہوں گے، مولانا نے فرمایا کہ دودھ وہی پانی ملتا ہے اور انڈے بھی فارمی ملتے ہیں، شہر ہی کا حال ہے، شہر قریب ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ بسلسلۂ ملازمت یا کام کرنے کیلئے شہر چلے جاتے ہیں، بچے بوڑھے رہ جاتے ہیں، رات کو کچھ نوجوان سنیما دیکھنے چلے جاتے ہیں، اس پر میں نے کہا کہ پھر تو آپ کا دیہات دیہات کی طیبات سے محروم ہے اور شہر کی برائیوں سے آراستہ ہے، یہ تو رہنے کی جگہ نہیں معلوم ہوتی ہے، بہر حال وطن ہونے کی وجہ سے اور اہل خاندان کی موجودگی میں مولانا کو وہاں قیام کرنا ہی تھا، وہیں رہ کر اپنی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء سے مکمل کی، وہیں سے روزانہ آنا جانا ہوتا تھا، راستہ بھی اتنا خراب تھا کہ روزانہ آنا جانا ایک دشوار مرحلہ تھا، درمیان میں ایک نالہ پڑتا تھا، اس میں پانی بہتا رہتا تھا، اس کو بھی دقت سے عبور کرنا پڑتا تھا۔

مولانا شروع سے ہی محنت اور مشقت کے عادی تھے، پھر طبیعت بھی سادگی اور قناعت پسند واقع ہوئی تھی، کوئی کچھ بھی کہہ دے مولانا برا نہیں مانتے تھے، ہنس کر ٹال دیتے تھے، ایک مرتبہ دارالاساتذہ میں استادوں کی مجلس گرم تھی، مولانا بشیر صاحب استاد دارالعلوم ندوۃ نے کہا کہ بھائی مولانا ناصر علی ہی بہت اچھے ہیں، کئی بار یہی جملہ دہرایا، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ مولانا ناصر صاحب کیا اچھے ہیں، کچھ تو واضح کیجئے کہ کیا

اچھے ہیں، مولانا بشیر صاحب نے یہ جملہ چست کیا کہ ہم تو حس پاکر پریشان ہوگئے ہیں ، مولانا ناصر علی صاحب اچھے ہیں یعنی وہ ایسے بے حس ہیں کہ ان کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی ہے کیونکہ ان میں حس ہی نہیں ہے، مجلس میں قہقہہ بلند ہوا، ناصر علی صاحب برداشت کر گئے، کوئی دوسرا ہوتا تو ہنگامہ مچادیتا۔

مولانا کی سادگی ملاحظہ کیجئے، ہمیشہ سائیکل سے آتے تھے، ایک بڑے دارالعلوم کے شیخ الحدیث تھے، مگر انہوں نے شیخ الحدیث ہوجانے پر بھی اپنی سائیکل کو خیرباد نہیں کہا کہ لوگ کیا کہیں گے، وہ اپنی روش پر قائم رہے، البتہ آخر میں صحت کی مجبوری سے ان کا لڑکا اسکوٹر سے لانے لے جانے لگا، ایک مرتبہ میں نے کہا کہ سائیکل کا مڈگارڈ ٹھیک کرا لیجئے برا لگتا ہے، سائیکل بالکل ننگی لگتی ہے، فرمایا کہ اس سے چلنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، ان کے نزدیک وہی خرابی خرابی ہے جو چلنے سے مانع ہو۔

ہمیشہ وہ مقصد کو سامنے رکھتے تھے، پڑھنا پڑھانا ان کا مقصد تھا، کہیں آنا جانا نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ جلسہ جلوس میں بھی شرکت نہیں فرماتے تھے، ایک مرتبہ میں نے کہا کہ جلسہ میں تشریف لے چلئے، کہنے لگے ہم کیسے جائیں ہم کو دارالعلوم کی طرف سے اجازت نہیں دی گئی ہے، میں نے کہا کہ فضیلتین کے طلبہ کو شرکت کی ہدایت کردی گئی ہے، جب طلبہ ہی نہیں ہوں گے تو آپ کس کو پڑھائیں گے، فرمایا کہ بہرحال مہتمم صاحب نے ہم کو آرڈر نہیں دیا ہے، تشریف نہیں لے گئے مزاجاً بھی ان کو جلسوں سے مناسبت نہیں تھی، میں نے بھی اصرار نہیں کیا کیوں کہ مجھ میں بھی کچھ اس طرح کے جراثیم ہیں۔

مولانا ہمیشہ سے جفاکش رہے اور محنت سے کام کرنے والے رہے، ابتداء عرصہ تک انہوں نے فقہ کا درس دیا، اس لئے وہ فقہ حنفی کے زوردار ترجمان تھے، ایک طالب علم نے ان سے کہا کہ آپ بخاری کا درس دیتے ہیں آپ کو بخاری پڑھانا چاہئے نہ کہ فقہ حنفی؟ مولانا نے جواب دیا کہ امام بخاری خود ہی حنفی ہیں، میں ان کو اہل حدیث کیسے بنادوں، طلبہ مولانا سے بے تکلف تھے، ہر بات پوچھتے تھے، وہ سب باتوں کا جواب

دیتے تھے، ان میں وقت بہت لگ جاتا تھا، اور کتاب کا نصاب پورا ہونا دشوار ہو جاتا تھا، فرماتے تھے خواہ نصاب پورا نہ ہو، طالب علم کے سوال کا جواب اس کو اطمینان بخش طریقہ سے مل جانا چاہئے، سوال اس کی سطح سے فروتر ہی کیوں نہ ہو، اس کا بھی جواب ہونا چاہئے، بعض استاد سوال بے جا کہہ کر آگے چلے جاتے ہیں اس کو وہ صحیح نہیں سمجھتے تھے۔

مولانا واقعی ایک پابند، کامل مدرس تھے، ایسی پابندی کرتے تھے کہ گھنٹہ ہوا کہ وہ درسگاہ میں آموجود ہوتے تھے، یہی نہیں بلکہ طلبہ سے بھی یہی چاہتے تھے، انہوں نے طلبہ کی حاضری کے لئے کئی تدبیریں اختیار کر رکھی تھیں، ایک تو یہ کہ غیر حاضری کو ڈبل غیر حاضری میں تبدیل کر دیتے تھے، کبھی جائز جرمانے کی شکل اختیار کرتے، کبھی ایسی پوچھ گچھ کرتے کہ آئندہ کے لئے طالب علم محتاط ہو جاتے، کبھی شفقت سے سمجھاتے، نرم گرم رویہ اپناتے، یہ اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے، ان کا یہ سارا محاسبہ عنداللہ مسئول ہونے کے اعتبار سے تھا۔

مولانا ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں کہ ان کو کبھی مالی دشواری زیادہ نہیں پیش آئی، جو بھی اللہ کے دین کی خدمت اخلاص سے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی روزی روٹی کا انتظام غیب سے فرما دیتا ہے، مولانا کے ساتھ بھی یہی ہوا، کہ ان کے پاس آبائی جائیداد میں صرف ڈھائی بیگھہ زمین تھی، اس سے کیا ہوتا تھا، ایک خاندان کے لئے اس سے کیا ہو سکتا ہے، مگر ہوا یہ کہ ایک غیر مسلم نے فارم کھولنے کے لئے اچھی قیمت دے کر وہ زمین خرید لی، مولانا کو اتنی قیمت مل گئی کہ انہوں نے اس کے بقدر دوسری زمین خرید لی، اور شہر میں ایک بڑا مکان بنوالیا، کچھ حصہ جو زمین کا باقی ماندہ تھا اس پر خاصی تعداد میں دکان بنوادی، مولانا کے تین بچے انہی دوکان پر کاروبار کرتے ہیں۔

مولانا اپنی علمی مشغولیت وفنائیت باقی رکھے ہوئے تھے، دوکان سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، اسی حال میں وہ یہاں سے رخصت ہوئے۔

☆☆☆☆

مولانا حافظ محبوب الرحمٰن صاحب ازہریؒ

چند یادیں ، چند باتیں

مولانا مفتی محمد ظہور ندوی

میں ۱۹۴۴ء میں جب تعلیمی غرض سے دارالعلوم میں داخل ہوا تو میرے لئے ہر شے یہاں کی دلکش اور متاثر کرنے والی تھی، دیہاتی ماحول سے ایک دم شہر کی رونق میں آیا تھا، اس سے پہلے کبھی گھر سے دور جانے کا سابقہ نہیں پڑا، اس لئے دارالعلوم کی عمارت اور یہاں کی ہر شے میں ایک کشش محسوس ہوئی، یہاں کے اساتذہ میں ایک سے ایک نامی گرامی اور اپنے علم اور رکھ رکھاؤ میں ممتاز تھے، ان اساتذہ میں مولانا محبوب الرحمٰن صاحبؒ اپنی عمر کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے اور اسی سال نئے بھی آئے تھے، اس لئے ان کو استاد سمجھنا بھی مشکل تھا، لیکن ساتھیوں اور پرانے طلباء سے جب ان کی فضیلت معلوم ہوئی کہ آپ نے جامعہ ازہر سے فراغت حاصل کی ہے اور عربی میں بلا تکلف روانی کے ساتھ لکھتے ہیں اور تقریر کرتے ہیں، اور جب خود بھی ان کی عربی تقریروں میں شرکت ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہاں دارالعلوم کا ہر استاذ ۲۷/رفٹ کا ہے، کوئی کسی سے کم نہیں ہے۔

پھر جب درجہ میں براہ راست پڑھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو ان کی بڑی اہمیت سمجھ میں آئی، مولانا سے انشاء پڑھنے کا موقع ملا، وہ انشاء میں معمولی کاٹ پیٹ کرتے، یعنی ضروری اصلاح فرماتے تھے، اس کے برعکس مولانا ناظم صاحب ندویؒ (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) بہت کاٹ پیٹ کرتے تھے، بعض جگہوں پر ہم لوگوں کو اس کا بھی شعور نہیں ہوتا کہ یہاں پر کاٹنے کی ضرورت ہے؟ ہمارے ساتھی اس کاٹ پیٹ سے بہت متاثر ہوتے، ایک ساتھی نے ایک ایسی انشاء لکھی کہ اس میں قرآن مجید کی سب آیتیں لکھ دیں، کہیں کہیں قال اور اقول وغیرہ کا اضافہ کر دیا، مولانا ناظم صاحب ندوی

رحمۃ اللہ بار بار پڑھتے مگر اصلاح کرتے تو کیا کرتے کہ یہ تو ساری قرآن کی آیات تھیں۔

طلباء مولانا محبوب الرحمٰن صاحب سے بہت زیادہ مانوس تھے، یوں بھی اس زمانہ میں ازہر کے فارغین کی بڑی شہرت تھی، یہ ایسے ہی تھا جیسے ایک زمانہ میں ولایت پلٹ ایک بڑی سند تھی، مگر بعد میں کثرت کی وجہ سے وہ بات نہیں رہی، مولانا محبوب الرحمٰن صاحبؒ سے ان کے تعلیمی مجاہدات اور سفر کی مشقتیں سنیں، اس لئے ان سے اور بھی زیادہ تعلق ہوگیا تھا، مفتی سعید صاحب ندویؒ (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء) میرے بہنوئی تھے، ان سے مولانا محبوب الرحمٰن صاحبؒ کا تعلق بہت زیادہ تھا، مفتی سعید صاحبؒ کو مولانا نے اپنا سرپرست بنالیا تھا، وہ مولانا کی اس طرح سرپرستی کرتے جیسے خاندان کے بزرگ اپنے متعلقین کی کرتے ہیں، مفتی صاحب مرحوم نے مولانا کو مکان خریدوایا، ملازمت کے لئے کلکتہ بھیجا، اس طرح پوری سرپرستی کی، مولانا نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں انٹرویو دیا اور کامیاب ہوئے، جس نے انٹرویو لیا وہ اس قدر متاثر ہوا کہ بعض چیزیں جو سرکاری طور پر مطلوب ہوتی ہیں ان کو نظر انداز کرکے آپ کو پاس کیا، انٹرویو دینے والوں میں کسی کے پاس ازہر کی سند نہ تھی، نیز مولانا کی حاضر جوابی سے وہ بہت متاثر تھا، ادھر مولانا کی بے نیازی بھی اس کو مسخر کر رہی تھی۔

مولانا کا قیام کلکتہ میں صرف ایک نوکری پیشہ کا قیام نہیں تھا، بلکہ وہ ایک دردمند داعی کی حیثیت سے رہے، ردقادیانیت پر گہرائی سے مطالعہ کیا اور عملاً اس فتنہ کے سدباب کے لئے تیار ہوگئے، کلکتہ کے آس پاس کے حلقوں میں خوب دورہ کیا اور قادیانیت کی مخفی خباثت کو ایسا اجاگر کیا کہ عوام کو قادیانیت سے گھن آنے لگی اور قادیانیت کے داعی ان حلقوں میں جانے سے شرمانے لگے اور بالآخر وہاں سے اپنا بوریہ بستر اٹھا کر بھاگ نکلے، مولانا نے ان کا یہاں تک تعاقب کیا کہ حج کے لئے سعودی عرب جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مولانا کے اندر بڑی خصوصیات تھیں، کس کس کا ذکر کیا جائے، ان خصوصیات میں

ایک اہم خصوصیت استغناء کی تھی، فرمایا کرتے تھے ''لاتسئل احداً'' کسی سے خدمت لینا، کسی چیز کو طلب کرنا ایک گناہ سمجھتے تھے، اکثر فرماتے تھے کہ حدیث میں ہے ''لاتسئل احداً'' اس حدیث پر شدت سے ان کا عمل تھا اور اس کے وہ بہت داعی تھے، کلکتہ میں بہت سے اصحاب خیر تھے، کبھی کسی امیر سے انتفاع کا کوئی تعلق نہیں رکھا، بلکہ سب کے محتسب ہی رہے:

اپنا سا زور کرکے تھکے منعمان دہر
مٹھی نہ کھل سکی میرے دست سوال کی

دوسری خصوصیت صبر واستقلال کی تھی، صبر میں ایسا کمال حاصل تھا کہ شاید کم مثالیں ملیں گی، کئی بار وہ ایسے بیمار پڑے کہ خیال ہوتا تھا کہ اب وہ چلے جائیں گے، لیکن صبر ایسا کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں، اسپتال میں داخل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے، بڑی ترکیبوں سے اسپتال لے جانا ممکن ہوتا۔ متعلقین کو بلانے کے لئے اجازت لی جاتی تو فرماتے ضرورت نہیں ہے، دوسروں کی راحت کا بڑا خیال فرماتے تھے، میں نے کئی بار عرض کیا کہ طلباء میں سے کوئی آجائے گا تاکہ تیمارداروں پر زیادہ بوجھ نہ پڑے، مگر راضی نہیں ہوتے، اندر خواہ کتنی ہی تکلیف ہو، شدید بے چینی ہو، درد ہو، گھبراہٹ ہو، مگر کیا مجال کہ پیشانی پر شکن پڑ جائے، دل سے آہ نکل جائے یا زبان سے کوئی بے صبری کا جملہ نکل جائے:

ذرا سمجھ کے نکل دل سے آہ سوز آگیں
مجھے سیے ہوئے زخموں کا اعتبار نہیں

مولانا کی تیسری خاص خصوصیت یہ تھی کہ بہت کم سنی میں قرآن حفظ کر لیا تھا، اچھے حفاظ میں ان کا شمار تھا، ستر محرابیں اپنے محلّہ کی مسجد میں سنائیں، اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے، یہ بالکل سچ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ساری دنیاوی ضروریات بھی بحسن وخوبی پوری فرمادیتے ہیں، مولانا مرحوم کے سارے کام پورے ہوئے، کوئی کام نامکمل نہیں رہا، بڑی عمر پائی، بہت سے کام کئے اور پھر بڑے

سکون واطمینان سے اللہ کے حضور حاضر ہوگئے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مرحوم اس دنیا سے چلے گئے، مگر اپنے پیچھے بہت سی یادیں چھوڑ گئے، آپ کا جذبہ، لگن، ایثار وقربانی، علماء اور نوجوان فضلاء کے لئے چراغ راہ کی حیثیت رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مولانا مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے، ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور مولانا کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

هو نعم المولىٰ و نعم النصير

صفات وکمالات

آپ کا سب سے نمایاں وصف فقہی بصیرت ہے جو فتوی نویسی کی صورت میں جلوہ گر ہے، نصف صدی سے زائد عرصہ سے آپ اس اہم اور نازک فریضہ کو انجام دے رہے ہیں، بڑی تعداد میں فتاوی آپ کے قلم سے صادر ہو چکے ہیں، آپ کے فتاوی ایجاز واختصار کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، فقہی متون پر گہری نظر، فقہ کے اصول وقواعد اور فقہی مسائل کا استحضار علماء سلف کی یاد تازہ کرتی ہے۔

آپ کا بے مثل قوت حافظہ، استحضار کی دولت جہاں آپ کی شخصیت کو مؤثر بناتی ہے وہیں حاضر جوابی، منطقیانہ اسلوب گفتگو، معاملہ فہمی اور مسائل کو حل کرنے کی خاص صلاحیت آپ کی شخصیت کے حسن کو دوبالا کرتی ہے، یہ وہ امتیازات ہیں جس نے آپ کو ذمہ داروں کی نظر میں قابل قدر، طلبہ کی نظر میں قابل فخر اور عام لوگوں کی نگاہ میں قابل رشک بنادیا ہے، آپ کی ذکاوت حس اور ظرافت طبع سے رفقاء کار کے ساتھ تلامذہ بھی شادکام ہوتے ہیں، ہم ان حوالوں سے آپ کی خدمت میں جذبہ سپاس پیش کرتے ہیں۔

ماخوذ از سپاس نامہ

دارالافتاء ندوۃ العلماء

مختصر تاریخ اور خصوصیات

مولانا مفتی ظہور ندویؒ

{حضرت مفتی صاحب مرحوم نے یہ مقالہ دسمبر ۲۰۱۲ء میں تنظیم ابناء قدیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ' کے دوروزہ اجلاس میں پیش کیا، اس اجلاس میں دارالعلوم کے پانچ بزرگ اساتذہ کو تدریسی خدمات ایوارڈ پیش کیا گیا، ان پانچ میں ایک حضرت مفتی صاحب بھی تھے}

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دارالافتاء کی تاریخ، خصوصیات اور اس کی خدمات پر کچھ کہنا مناسب نہیں لگتا، اچھا تو یہ تھا کہ کوئی صاحب قلم اس موضوع پر اظہار خیال کرتے، میں اس کا ایک ذمہ دار رکن ہوں، میرا اس موضوع پر لکھنا اور اس کی تفصیلات میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے یہ تو ایک طرح کی خودستائی ہے، اپنی تعریف آپ کرنا ہے، ہمارے اسلاف کا بھی یہ شیوہ نہیں رہا، اور سچی بات تو یہی ہے کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید، البتہ ایک دوسرا پہلو یہ کہ عزیزی مولوی سلمان ندوی نے مجھ سے اس موضوع پر کچھ لکھنے کو کہا، ان کی فرمائش پوری کرنے کو ایک اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں، اس لئے یہ چند سطریں سپرد قلم کر رہا ہوں۔

میرے خیال سے ندوہ کے دارالافتاء کی تاریخ تقریباً اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود تحریک ندوۃ العلماء کی، ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا، اور اس کے دو سال بعد یعنی ۱۳۱۳ھ میں ندوہ کے زیر اہتمام دارالافتاء کا قیام عمل میں آیا، اس اجلاس میں مولانا محمد علی مونگیریؒ نے دارالافتاء کی تجویز جن الفاظ میں پیش کی تھی اس سے دارالافتاء کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ میرے زمانہ طالب علمی میں دارالافتاء کے مفتی مولانا محمد سعید صاحب ندویؒ تھے، ان سے پہلے میرے ہی ہم وطن مولانا شبلی فقیہ

مرحوم جیراجپوریؒ یہاں مفتی تھے، میں نے ان کو دیکھا ہے، اس وقت وہ کافی ضعیف ہوگئے تھے، مولانا شبلی فقیہ سے پہلے مولانا عبداللطیف سنبھلی رحمانیؒ مفتی ندوہ تھے جو مولانا لطف اللہ گڑھیؒ کے اخیر دور کے تلامذہ میں سے تھے اور ابتداء میں تو مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ خود ہی اس شعبہ کے سرپرست تھے۔

مفتی سعید صاحب ندوی کے دور تک بلکہ اس کے بعد میرے زمانہ میں بھی دارالافتاء کی طرف وہ رجحان نہیں تھا جو بعد کو ہوا، جس کی وجہ سے اس کا مستقل انتظام نہیں تھا، اور نہ ہی فتاویٰ کی نقلیں رکھنے کا اہتمام تھا، عباسیہ ہال میں اس زمانہ میں لائبریری ہوا کرتی تھی، اسی میں ایک نشست اس دارالافتاء کی لگی ہوئی تھی، اس کے ساتھ ایک الماری بھی تھی، بس یہی کل دارالافتاء تھا، اس پورے دور میں فتاویٰ کی نقلیں رکھنے کا خاص اہتمام نہیں رہا، کبھی نقل رکھی گئی، اور کبھی نہیں، پھر جو نقل رکھی گئی وہ بھی بعد کو محفوظ نہیں رہی۔

۱۹۴۴ء میں ندوہ میں میرا داخلہ ہوا مفتی سعید صاحب ندویؒ میرے استاذ بھی تھے اور مربی بھی، وہ رشتہ میں میرے بہنوئی تھے، اس وجہ سے ان سے زیادہ قربت تھی، میں چونکہ اونچے درجہ کا طالب علم تھا، اس لئے مفتی صاحب مجھ سے فقہ کے حوالے نکلوایا کرتے تھے، اور اخیر دور میں تو میں فتاویٰ لکھتا بھی تھا، ان کے انتقال کے بعد جب میں دارالعلوم میں مدرس ہو چکا تھا، فتاویٰ لکھنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی، یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے۔

اللہ جزائے خیر دے عزیزی مولوی سلمان کو جن کی محنت اور جدوجہد سے دارالقضاء ابتداء لکھنؤ میں قائم ہوا، ۱۹۹۲ء میں احاطہ دارالعلوم میں ایک شاندار جلسہ ہوا، جس میں مولانا منت اللہ رحمانیؒ اور دوسرے بڑے بڑے علماء شریک تھے، اس موقعہ پر ''المعہد العالی للقضاء والافتاء'' کے نام سے ایک مستقل شعبہ کا قیام ہوا، اس کے بعد ہی دارالافتاء کو ایک مستقل ادارہ کی حیثیت حاصل ہوئی، اب اس کی طرف رجحان بہت بڑھ چکا تھا، اس لئے بھی اس شعبہ کو منظم کرنے کی ضرورت تھی، اس کے بعد فتویٰ کے نقل رکھنے کا باضابطہ سلسلہ شروع ہوا، اس وقت سے اب تک جتنے فتاویٰ یہاں سے دئے گئے، الحمدللہ سب محفوظ ہیں، اگر اس سے پہلے کے فتاویٰ محفوظ ہوتے تو یہاں فتاویٰ کا بہت بڑا سرمایہ ہوتا۔

اب جہاں تک اس کی خصوصیات کی بات ہے تو ہم اپنی زبان سے اپنی تعریف کیا کریں، اپنی ستائش مناسب نہیں، دوسروں نے اس موضوع پر لکھا ہے وہ کافی ہے، یہاں کے فتاویٰ کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے، اس لئے صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کردینا کافی ہے:

پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ اختیار کی گئی ہے، جو ندوہ کی اصل بنیاد ہے، ندوہ نے ہمیشہ اعتدال کی بات کہی ہے، اس لئے اس کے دارالافتاء کا بھی یہی مزاج ہے۔

اعتدال کی پہلی مثال:

مثال کے طور پر جمعہ کے سلسلے میں یہاں سے یہ فتویٰ دیا جاتا ہے کہ جن دیہاتوں میں ایک طویل مدت سے جمعہ پڑھا جاتا ہے وہاں پر جمعہ قائم رکھنا جائز ہے، ختم نہیں کرنا چاہئے، البتہ جن دیہاتوں میں جمعہ قائم نہیں ہے وہاں ظہر پڑھنا چاہئے، یہ دینی دعوتی کام کے لئے ضروری ہے، فقہ حنفی کی شرط (مصر کی شرط) لازم نہیں ہے، دوسرے فقہی مذاہب میں یہ شرط نہیں ہے، خود فقہائے احناف نے مصر کی شرط میں تخفیف سے کام لیا ہے، قصبات کو بھی مصر کے حکم میں مانا ہے۔

اعتدال کی دوسری مثال:

مطلقہ ثلاثہ کی ہے کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاق دیدی ہے تو اگر شخص مذکور اہل حدیث ہے تو اس کے حق میں یہ ایک طلاق ہے، عدت میں رجوع کر سکتا ہے، اگر وہ شخص حنفی ہے اور اہل حدیث سے فتویٰ لے کر اپنی نفس کی اتباع میں ایسا کرتا ہے تو اس کے لئے جائز نہیں ہے، کیونکہ ائمہ اربعہ کے نزدیک یہ طلاق مغلظہ ہے، اس میں گنجائش نہیں نکالی جاسکتی ہے۔

اعتدال کی تیسری مثال

اگر کوئی اسلام میں داخل ہوتا ہے اور تین طلاق دے دیتا ہے تو اس کے لئے ایک طلاق کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے کیونکہ وہ نہ تو حنفی ہے اور نہ اہل حدیث، اس نقطہ نظر سے اس پر فقہ حنفی کا قانون لاگو نہیں کیا جاسکتا ہے، علامہ سلیمان ندویؒ کا ایک واقعہ طلاق ثلاثہ

کے بارے میں مشہور ہے، آپ نے مولانا مفتی شفیع صاحبؒ اور دوسرے بڑے علماء کی
موجودگی میں اپنی رائے کا اظہار کیا اور سبھوں نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ کہا کہ یہ بات
سید صاحبؒ ہی کہہ سکتے تھے۔

اعتدال کی چوتھی مثال

اختلافی مسائل میں حد سے تجاوز کرنا صحیح نہیں ہے، جو جس مسلک کا ہو وہ اس پر
عمل کرسکتا ہے، خاص طور پر مستحبات میں بہت شدت اختیار کرنا کہ ایک دوسرے پہ طعن و
تشنیع کرنا اور لڑائی جھگڑا کرنا درست نہیں ہے، آخر اس میں کیا حرج ہے کہ وہ جس کو افضل
سمجھتا ہے اس پر عمل کرے، فروعی مسائل میں حد سے تجاوز کرنا کسی ایک رائے پر اصرار کرنا
اور دوسری رائے کی مکمل نفی کرنا صحیح نہیں ہے۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہاں کے دارالافتاء کی یہ ہے کہ جواب سادہ اور عام فہم
زبان میں دیا جاتا ہے، کیونکہ اکثر سوال کرنے والے عربی اور مغلق زبان سمجھنے کی صلاحیت
نہیں رکھتے ہیں، قدیم علماء کی زبان خالص علمی و اصطلاحی زبان ہوتی ہے، جس کے وہ
سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں، اس لئے ہمارے یہاں پوچھنے والے کو ان کی سادہ
زبان میں ہی جواب دیا جاتا ہے، کوئی بات دفع دخل مقدر کی نہیں ہوتی ہے کہ وہ کسی الجھن
میں مبتلا ہو، حتی الامکان اغلاق اور طویل عبارت سے احتراز کیا جاتا ہے تا کہ وہ آسانی
سے سمجھ جائیں، ایسے بھی فتاوے دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ فتویٰ کے حدود سے باہر
ہیں، وہ مقالہ اور علمی تحقیق کے حدود میں داخل ہوگئے ہیں، گویا مستفتی کسی چوراہے پر
حیران و پریشان کھڑا ہے، اس کو سیدھی راہ نہیں مل رہی ہے، وہ کرے تو کیا کرے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مبتدعین کے رد میں کوئی تیز و تند جملہ استعمال نہیں کیا
جاتا ہے، بلکہ متانت اور سنجیدگی سے جواب دیا جاتا ہے، مبتدعین کے بعض اعمال شرکیہ
ہیں، ان کے جواب میں ان کو مشرک یا کافر کے لفظ سے یاد نہیں کیا جاتا ہے، بعض غالی قسم
کے لوگ ان کو مشرک اور کافر کہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب شرک کیا تو مشرک ہوئے، کفر
کیا تو کافر ہوئے، ہم بتاویل ان کو عمل شرک کرنے والا قرار دیتے ہیں، مشرک نہیں کہتے

ہیں، مشرک کے کلی احکامات میں داخل نہیں کرتے ہیں، فرق سے متعلق جو فتاویٰ یہاں
سے دئے گئے ہیں ان میں یہ خصوصیت نمایاں طور پر نظر آئے گی۔

حدیث شریف میں ہے کہ جن میں تین خصلتیں پائی جائیں وہ منافق ہے، یہ وہ
منافق نہیں ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین کا گروہ تھا، یہ عملِ نفاق
والا منافق کہلائے گا۔

چوتھی خصوصیت:

یہاں کے دارالافتاء کی یہ ہے کہ دور حاضر کے مسائل خواہ وہ معاشرتی ہوں،
کاروباری ہوں، عمرانی ہوں، اقتصادی ہوں، ذرائع آمدنی کی جدید شکلیں ہوں، جو
موجودہ دور میں نئی نئی شکلوں میں رائج ہوگئے ہیں، ان کی شرعی حیثیت واضح کرنا، بدلتے
ہوئے حالات میں ان مسائل کا شرعی حل پیش کرنا جدید دور کا چیلنج ہے، اس میں کافی تحقیق
وتدقیق کی ضرورت ہے، ایسے مسائل میں ہمارے یہاں خوب غور و فکر اور اجتماعی بحث و
مناقشہ کے بعد ہی جواب لکھا جاتا ہے، اس کے ساتھ دیگر علماء سے بھی رجوع کر کے عمل
کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔

۵۔ پانچویں خصوصیت:

یہ ہے کہ ملک میں بہت سے دارالافتاء ہیں، مشہور و معروف اہل علم ہیں جو دینی
معلومات اور دینی روح و مزاج سے واقفیت رکھتے ہیں، ان سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے
تا کہ اختلاف نہ ہو، امت میں انتشار نہ ہو، علماء کے ساتھ عوام کا حسن ظن قائم رہے۔

ایک اہم خصوصیت

یہ بھی ہے کہ استفتاء کے جواب میں حکم شرعی بتانے کے ساتھ دعوتی اور تذکیری
پہلو کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے۔

یہ چند باتیں میرے ذہن میں تھیں جو پیش کی گئیں، ورنہ ان خصوصیات کے
لئے ایک دفتر کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کے عمل کو قبول فرمائے، اور ایمان پر
خاتمہ بالخیر فرمائے۔ آمین!

طالبانِ علوم نبوت
ہدایات و گزارشات

مولانا مفتی محمد ظہور ندویؒ

{حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جمالیہ ہال، رواق شبلی (دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) میں طلبائے منی پور کے سالانہ اجلاس تقریر فرمائی تھی، جسے محمد نجم الدین ندوی منی پوری (رفیق دار عرفات تکیہ کلاں، رائے بریلی) نے آڈیو سے منتقل کیا، ہم عزیز موصوف اور تعمیر حیات کے شکریہ کے ساتھ یہ تقریر قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں}

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد!

قبل اس کے کہ میں آپ سے کچھ کہوں، میں آپ سے اس بات کی معذرت چاہتا ہوں کہ میں پہلے تو آپ کے جلسوں میں شریک ہوجاتا تھا اور اول سے لے کر آخر تک رہتا تھا، لیکن اب ایسا معذور ہوگیا ہوں کہ صرف تبرکاً اور پچھلے رکارڈ کو قائم رکھنے کے لیے شریک ہور ہا ہوں، اسی لیے میں نے آپ کی دعوت منظور کر لی اور شریک ہوگیا، لیکن اس سے پہلے بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ اب میری سماعت کام نہیں کر رہی ہے، میں کچھ بھی نہیں سمجھ پاتا ہوں کہ کیا کہا گیا، کیا سنا گیا، اور خاص طور پر جو ہال میں آواز گونجتی ہے

اس کی وجہ سے مجھے اور بھی زیادہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، گویا میں جسم کے اعتبار سے حاضر ہوں لیکن فکر و دماغ کے اعتبار سے غائب ہوں، اس لیے عذر پیش کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ اس حالت میں آپ کے لیے میرا رہنا کوئی زیادہ مفید نہیں ہے، البتہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں اس سے ان شاء اللہ آپ کو نفع ہوگا، وہ میں آپ کے سامنے کہہ دیتا ہوں۔

کامیابی کا راز

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی جو بھی ترقی کرتا ہے، بنتا ہے، کامیاب ہوتا ہے، وہ اپنی ذاتی محنت سے ہوتا ہے، کسی استاد کے بھروسہ پر ایسا نہیں ہوتا ہے، یہ ضرور ہوتا ہے کہ استاد سے مدد اور صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور آدمی جلد اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہے اور سلیقہ حاصل کر لیتا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ سارا دار و مدار استاد پر ہو، آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جو شخصیتیں باکمال ہوئیں وہ کسی استاد کی وجہ سے نہیں ہوئیں، اگر کسی استاد کی وجہ سے ہوتیں تو اس استاد کے بہت سے شاگرد تھے، لیکن سب کہاں باکمال ہوئے، اگر استاد معیار ہوتا کسی کے باکمال ہونے یا باصلاحیت ہونے کے لیے تو ہر ایک باکمال ہوتا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ بعض اساتذہ کے بے شمار شاگرد ہوئے البتہ ان میں چند ہی نامور اور کامیاب ہوئے، مثلاً: علامہ شبلی نعمانیؒ کے بہت سے شاگرد ہوئے لیکن ان میں سے جو ممتاز ہوئے، علامہ سید سلیمان ندویؒ ہوئے، یا مولانا عبدالسلام ندویؒ ہوئے، یا اقبال سہیلؒ ہوئے، گویا یہ چند گنے چنے لوگ ہیں جو کامیاب ہوئے، تو اگر استاد کی محنت ہی سے سب کامیاب ہوجاتے تو سبھی کامیاب ہوتے، لیکن ان میں سے چند ہی کامیاب ہوئے، اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ آدمی کی خود محنت اور اس کی مشقت اور اس کا شغف خود اس کو بناتا ہے، ہاں یہ ہے کہ اس میں استاد سے مدد مل جاتی ہے، اور صحیح رہنمائی ہوجاتی ہے، اور کم وقت میں کامیابی ہوجاتی ہے، لیکن سارا بھروسہ یا ساری کامیابی استاد ہی کی وجہ سے ہو، ایسا نہیں ہوتا، تو پہلی بات یہی

ہے کہ آپ اپنی محنت لگائیں، اور اپنی جان کھپائیں، اور آپ وقت کی پابندی سے کام
کریں، تو انشاء اللہ کامیابی آپ کی ضرور ہوگی۔

پابندی کا فائدہ

لیکن اگر آپ محنت اس طرح سے کریں کہ کچھ دیر کے لیے آپ نے خوب محنت
کی، رات بھر جاگے، رات بھر پڑھا، جیسا کہ امتحان میں طلباء جانفشانی کرکے دن رات
ایک کردیتے ہیں، تو یہ وقتی محنت آدمی کو کامیاب نہیں کرتی، اس وقتی محنت سے آپ امتحان
میں تو پاس ہوجائیں گے، اچھے نمبر آجائیں گے، کچھ دنوں کے لیے تھوڑی بہت صلاحیت
بھی پیدا ہوجائے گی، لیکن وہ دیرپا نہیں ہوگی، اگر آپ امتحان میں محنت کرکے گئے اور
پرچہ کرکے باہر نکلے تو وہ سب صاف ہوجائے گا، اس لیے کہ وہ وقتی آیا تھا اور وقتی چلا گیا،
کیونکہ جو چیز وقتی طور پر آتی ہے وہ وقتی طور پر جاتی بھی ہے، اور اگر آپ ہمیشہ پڑھتے
رہیں اور محنت کرتے رہیں اور اپنے مقصد سے لگن رکھتے ہوں اور اس پر محنت کرتے ہوں
اور برابر اس میں مشغول رہیں، اور وقت کی پابندی کریں، اس کا احترام کریں تو ان شاء
اللہ آپ کی کامیابی ضرور ہوگی۔

وقت کی قدردانی کا فائدہ

جنھوں نے بھی وقت کی قدر کی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب بنایا ہے،
فی الحال کے لوگوں میں آپ کے لیے مثال پیش کرتا ہوں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ
کی، وہ ایسے وقت کے قدرداں تھے کہ روزانہ جو کام کرنے کا معمول تھا وہ پورا معمول
انجام دیتے تھے، اور اگر کوئی اور کام کرنا ہوتا تھا تو اس کے لیے الگ سے وقت فارغ
کرتے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جیسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا
کہ: میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں اور آپ کے پندرہ منٹ لینا چاہتا ہوں، تو
انہوں نے اس وقت کے لیے اجازت دے دی، تو اب انہوں نے حضرت مولاناؒ کو

یہ جو وقت دیا تو اس میں وہ یہ کرتے تھے کہ روزانہ تین دن پانچ منٹ زیادہ کام کرتے
تھے، پھر اس کے بعد پندرہ منٹ کی جو کسر نکلتی تھی، وہ وقت مولانا کو دیتے تھے، تو پانچ
پانچ منٹ زیادہ کام کیا، تو تین دن میں پندرہ منٹ ہوگئے، اور جس دن مولانا کی
ملاقات کا وقت آیا تو وہ وقت دیا، تو گویا اپنا وقت جو انہوں نے لگانا شروع کیا تھا وہ
پورا پورا اپنے کام میں وقت صرف کرتے تھے اور خارج میں کسی کو وقت دینے پر مزید
وقت سے کچھ منٹ لے کر وقت کی قدردانی دکھاتے تھے، لیکن ہم لوگ کا حال یہ ہے
کہ وقت جارہا ہے کوئی پرواہ نہیں، کب صبح ہوئی، کب شام ہوئی، نہ کوئی پروگرام ہے،
نہ کوئی تسلسل ہے، اور کبھی کہیں چلے گئے، کبھی سیر و تفریح میں چلے گئے، یاد رکھیں اس
طرح آدمی کو کامیابی نہیں ملتی ہے، بلکہ مستقل آپ محنت مجاہدہ سے کام کریں تو کامیابی
ملتی ہے۔

نقد نہ کہ اُدھار

محنت و مجاہدہ کا سودا نقد ہوتا ہے، یہ نہیں ہے کہ آپ نقد نہ کریں بلکہ ادھار رکھیں،
اس لیے کہ یہاں ادھار کا کوئی معاملہ نہیں ہے، بلکہ نقد کا معاملہ ہے، کہ ایسا کرلیں گے تو
ایسا ہوجائے گا، اسی کو جوہر نے کہا ہے۔

جان نبض دو جام کوثر ابھی ملے
ساقی کو کیا پڑی ہے کہ مے ادھار دے

اس میخانہ میں ادھار کا کوئی معاملہ نہیں ہے، یہاں تو یہی ہے کہ آپ نقد ادا
کریئے آپ کو شراب مل جائے گی، اگر آپ استطاعت نہیں رکھتے ہیں تو السلام علیکم، وعلیکم
السلام، آپ اپنی جگہ میں اپنی جگہ، تو یہاں پر نقد کا سودا ہے، اور یہاں پر آپ کو مجاہدہ کرنا
ہے اور علم کو سیکھنا ہے، جب تک آپ اپنا سب کچھ علم کے حوالہ نہیں کریں گے تو اس کی
روشنی آپ کو نہیں مل سکتی، آپ یہ چاہیں کہ میری صحت بھی بہت اچھی رہے، میں بہت آرام

سے بھی رہوں، یہ چاہیں کہ میں کسی اور جگہ بھی امتحان دے کر بھی دنیوی ترقی حاصل کرلوں تو ممکن ہے کہ آپ اس میں کامیاب ہوجائیں، لیکن یہاں کی مجاہدہ والی اور علمی لائن میں ایسا کچھ نہیں ہے، یہاں تو وقت کی پابندی اور مجاہدہ اور مشقت سب کچھ ضروری ہے، اسی لیے آپ کچھ دنوں کے لیے اپنے تمام مشاغل سے یکسو ہوجائیں، یہ نہیں کہ وہ بھی کرنا ہے وہ بھی کرنا ہے، بہت سی چیزیں ساتھ لے کر چلنے میں کسی میں کامیابی ملنے والی نہیں ہے، آپ کو سب سے الگ ہوکر مجاہدہ کے لیے یکسو ہونا پڑے گا، پڑھنے پڑھانے اور استفادہ کے لیے، تب آپ کامیاب ہوں گے، لیکن اگر اس طرح سے آپ نے نہیں پڑھا تو کامیاب نہیں ہوسکتے۔

محنت کی شرط

محنت ہر جگہ شرط ہے، یہ نہیں کہ اسی لائن میں محنت شرط ہے، بلکہ دنیوی لائن میں بھی محنت کی بہت ضرورت ہوتی ہے، دنیا میں بھی وہی کامیاب ہوتے ہیں جو محنت کرتے ہیں اور اگر وہ محنت نہیں کرتے ہیں تو ان کو دنیا بھی نہیں ملتی ہے، میں آپ کو مثال کے طور پر واقعہ سناتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بارک صاحب ایک بہت بڑے تاجر ہیں، ان کو خیال ہوا کہ ہمارے ندوہ کے فارغین کو روزی روٹی کی ضرورت ہوتی ہے، اپنی دنیوی زندگی گزارنے کے لیے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو ایسا کیا جائے کہ یہاں کے فارغین کو اپنی دکان میں لے جاکر کے ان کو کچھ سکھائیں اور ان سے کام کی عادت ڈلوائیں اور پھر ان کو اپنا کاروبار کرنے پر آمادہ کریں، تو خیر خواہی کے جذبہ سے انہوں نے ایسا کیا کہ کچھ فارغ شدہ لڑکوں کو ندوہ سے اپنی دکان پر لے گئے، تاکہ ان کو کچھ سکھائیں اور بتائیں، ان کی آگے کی زندگی کو سنوارنے کے لیے، لیکن انہوں نے اپنے پاس رکھنے کے کچھ دنوں بعد ان بچوں کو ہٹا دیا، اور ندوہ آئے تو ہم کو معلوم ہوا وہ بچے وہاں سے ہٹ گئے، ہم نے ان سے سبب پوچھا کہ آپ نے اچھے جذبہ اور خدمت کے لیے ارادہ کیا تھا اور عمل بھی شروع

کیا تھا لیکن یہ کیا ہوا کہ اچانک آپ نے ان سب کو ہٹا دیا اور وہ سب چلے گئے تو انہوں نے بتلایا کہ ہم ان کی بہت دنوں تک عادت ڈلواتے رہے، سمجھاتے رہے، لیکن وہ اپنی عادت سے باز نہیں آئے، ہم نے کہا کیا عادت تھی؟ انہوں نے کہا کہ ہماری دکان پر رہتے تھے اور ان کو قیلولہ سے فرصت نہیں تھی، تو کوئی دکان بھی قیلولہ سے نہیں چلتی ہے، بولے ہماری دکان ان کے قیلولہ سے تباہ ہورہی تھی اس لیے ان کو ہٹا دیا، تو ہم نے ان سے کہا یہ تو غلطی ہمیں لوگوں کی ہے، ان کی کم ہے، ہماری زیادہ ہے کہ نو سال تک ان کو قیلولہ کراتے رہے، اس لیے وہ اس کے عادی ہیں، لہٰذا آپ کو بھی نو سال تک ان کو ٹرینڈ کرنا ہوگا، تب جاکر ان کا قیلولہ چھٹے گا اتنی جلدی تو نہیں چھوٹ پائے گا، تو دنیا میں بھی محنت ہی سے کام ہوتا ہے، اور محنت لگانے سے ہی کامیابی ملتی ہے، اور دین میں تو اور زیادہ مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے کہ یہاں فی الحال نظر تو نہیں آتا ہے، یہ تو بعد میں آخرت میں یا جب انعامات کی بارش ہوگی تب پتہ چلے گا، فی الحال تو کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دے رہی ہے اور بلا وجہ مجاہدہ کیا جارہا ہے تو آدمی کی طبیعت نہیں لگتی ہے، اس لیے یہاں مجاہدہ کی ضرورت ہے۔

رضائے الٰہی کا راز

اس لائن میں انسان کو صرف اللہ کی رضا کے لیے زندگی گزارنی پڑتی ہے، کچھ خوشگوار و ناخوشگوار باتیں بھی برداشت کرنا پڑتی ہیں، استاد کی ڈانٹ بھی کھانا پڑتی ہے، نگراں کے بھی جب تیور بدلتے ہیں تو اس کی بھی سننی پڑتی ہے، تو یہاں نفس مارنا پڑتا ہے، مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، تب آدمی بنتا ہے، تو پہلی بات یہ ہے کہ آپ مجاہدہ کریں اگر کامیاب ہونا چاہتے ہیں اور نقد سودا کریں ادھار کا معاملہ نہ رکھیں، یہ نہیں کہ بزرگوں کو دیکھا کہ ان کے پاس بڑی فتوحات آرہی ہیں، لوگ ان کی قدر کرتے ہیں، ان کا اکرام کرتے ہیں، ان کو آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں، سر پر بٹھاتے ہیں، ان کی قدم بوسی کو اپنی عزت سمجھتے ہیں، ان کی تکریم کرتے

ہیں، یہ سب مراحل جو ہم دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا اونچا مرتبہ ہے، لیکن ان کو یہ ایسے ہی حاصل نہیں ہوا ہے، اگر آپ بھی اس کے طالب ہیں، اللہ کی رضا وخوشنودی کے طالب ہیں، دنیا وآخرت میں کامیابی کے طالب ہیں تو آپ کو مجاہدہ کرنا پڑے گا، مشقتیں اٹھانی پڑیں گی، اور اس سلسلہ میں خاص طور پر بزرگوں اور بڑے لوگوں کی سیرت پڑھنا بھی مفید ہوگا، تاکہ ان کے حالات سے واقف ہوں، ان کے مجاہدہ پر غور کریں، تب آپ کو اطمینان ہوگا کہ مجاہدہ کرنے کے بعد وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے، بیٹھے بٹھائے کسی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا ہے، اور بزرگوں کے مجاہدے تو بہت ہیں، اور جو کتابیں بزرگوں پر لکھی گئی ہیں ان کو آپ پڑھئے اور اس میں جو قابل استفادہ چیز ہو اور آپ کو اس سے مناسبت ہو اور آپ کا دل قبول کرے تو اسی لائن پر آپ چلئے، صرف ایسے عیش پرستی سے یا وقت کے ضیاع سے، آرام طلبی سے، ٹہلنے پھرنے، گھومنے نکلنے سے یہ چیزیں حاصل نہیں ہوسکتیں، پھر نتیجہ یہی ہوگا کہ آپ چند دن گزاریں گے اور اس کے بعد چلے جائیں گے لیکن کچھ نہیں آئے گا۔

ایک سچ

ندوہ کے ایک فاضل میرے پاس آئے تو میں نے ان سے یہ کہا کہ بھئی یہ چیز پڑھو اور بتاؤ اس کا کیا مطلب ہوا، لیکن وہ کچھ نہیں بتا پا رہے تھے تو میں نے غصہ میں یہ کہا کہ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم ندوہ میں نو سال تک گھاس کھودتے رہے، ورنہ نو سال تک تو آدمی کتنا پڑھ اور سمجھ لیتا ہے، تو بہت سے فارغ یہاں سے جاتے ہیں اور وہ بالکل ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں کہ گھاس کھودتے رہے اور بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس فرسٹ کلاس کا امتیازی نمبر ہوتا ہے، اور لقبناہ بالعالم کی پوری سند ہوتی ہے، اور پورے علوم کی فہرست ہوتی ہے کہ فلاں فلاں علوم پڑھے ہیں، یہاں تک کہ سند دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو اپنے زمانہ کے افلاطون ہوں گے، سقراط و بقراط ہوں گے، لیکن جب کہیں باہر بیٹھتے ہیں تو ایسے جوابات دیتے ہیں کہ ندوہ شرمندہ

ہو جاتا ہے، ندوہ کو بھی خبریں ملتی رہتی ہیں کہ لڑکوں نے کیا جواب دیا اور کیا پوچھا گیا، باہر کے جو لوگ امتحان لینے والے ہوتے ہیں وہ ہمارے ملنے والے ہوتے ہیں تو وہ سناتے رہتے ہیں، اس لیے ہمیں یہ سب معلوم ہوجاتا ہے، تو ہم لوگوں کی گردنیں جھک جاتی ہیں کہ ہم نے ان کو فرسٹ کلاس اور عالم اور کامل کی سند دی ہوتی ہے اور بعض معمولی سوال کا جواب بھی نہیں دے پاتے، بلکہ وہ بسا اوقات شکایت بھی کرتے ہیں کہ اب ندوہ میں کیا ہو رہا ہے کہ ایسے کم علم استعداد والے لڑکے پہنچ رہے ہیں، امتحان دے رہے ہیں، تو ہم کو بھی حیرت ہوتی ہے، پہلے یہ ہوتا تھا کہ ندوہ کی سند کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ ان کے انٹرویو یا ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، جو پہلے یہاں سے پڑھ کر جاتے تھے، باہر انٹرویو میں ان کی سند ہی کافی ہوتی تھی ان کو کسی سوال کے جواب کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، لیکن اب ان کا باقاعدہ ایسے ٹیسٹ ہوتا ہے جیسے ایرے غیرے کا ہوتا ہے، اب ندوہ کا کوئی ایسا امتیاز نہیں رہا کہ بس سند پر بھروسہ کرلیں۔

ذاتی محنت کا فقدان

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے یہ ذمہ داری اساتذہ، یہاں کے اسٹاف، یہاں کے لوگوں کی بھی ہے، لیکن سب سے اہم ذمہ داری طلباء کی ہے اس لیے کہ جو محنت کرکے کامیاب ہوں گے وہ انشاء اللہ کامیاب ہوجائیں گے، چاہے استاد اس درجہ کے نہ بھی ہوں، کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے سب استاد ویسے ہی تھے جیسے شبلی تھے؟ ارے بہت سے ایسے بھی رہے ہوں گے کہ اس درجہ کے نہیں تھے لیکن ان سے انہوں نے پڑھا اور ان کی صلاحیت پختہ ہوئی البتہ وہ علامہ شبلی کے مقرب ہوئے، اور علامہ شبلیؒ سے مزید استفادہ کیا، یا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ہیں، انہوں نے کبھی بھی مصر مدینہ یا عربی ممالک میں عربی نہیں پڑھی، مولانا محمد ناظم ندویؒ جو ادیب اول یہاں کے ہوئے انہوں

نے کبھی کہیں نہیں پڑھا بلکہ یہیں پڑھا، مولانا مسعود عالم ندویؒ تھے کہیں باہر نہیں گئے سب نے یہیں پڑھا، تو یہ جو چند میں نے نام لیے ہیں تو ایسے ندوہ کے بہت سے قدیم فاضل ہیں، جنہوں نے عرب ہی نہیں دیکھا، نہ وہاں گئے، نہ اس ماحول سے کوئی استفادہ کیا، لیکن اس کے باوجود بھی ان کی عربی کا لوہا عرب مانتے تھے، اور عرب کے ادباء مانتے تھے، عرب کے چوٹی کے لوگ ان کے قدرداں تھے، ان کے سکے کے قائل تھے، لیکن یہ صرف ان کی صلاحیت کی بناء پر ہوا، اس بناء پر نہیں کہ وہ ندوے سے متعلق ہیں، صرف ندوی ہیں، ارے صرف ندوی ہونا کافی نہیں تھا، بلکہ آدمی کا معیار اس کو اونچا کرتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ صرف ندوی لکھ دیا تو آپ بہت بلند ہوگئے، علامہ ہوگئے، یہ کچھ نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ ندوی آپ لکھیں اور اس کے بعد معیار پر نہ اتریں تو لوگ آپ کو تھو تھو کریں گے، آپ ہی کو کہیں گے کہ یہ تو جعلی آدمی معلوم ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کہیں سے سند جعلی حاصل کر لی ہے۔

اپنا مقام پیدا کر

آپ ایسا موقع ہرگز نہ آنے دیں کہ خدانخواستہ کوئی آپ کے ساتھ بدگمانی کرے، کیونکہ ندویوں کی ایک قسم تو آپ نے پڑھی ہی ہوگی کہ بہت سی قسم کے لوگ اپنے کو ندوی لکھنے لگے حالانکہ ندوی نہیں ہیں، میں کلکتہ گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں ایک صاحب ندوی کلکتہ میں رہتے ہیں تو مجھے شوق ہوا کہ اس زمانہ کے ندوی سے مل لینا چاہیے، ان سے خیریت معلوم کر لینا چاہیے، ان کا معیار معلوم کر لینا چاہیے، تو میں ان سے ملنے گیا، جب ان سے کچھ تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کے ماموں ندوہ میں تھے، اور وہ اپنے ماموں کے مہمان رہے ایک ہفتہ، اور اس کے بعد کلکتہ پہنچ گئے تو انہوں نے اپنے کو ندوی لکھنا شروع کر دیا، تو مہمان کی حیثیت سے ایک ہفتہ کے ندوی تھے، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا جب امتحان ہونے لگے تو یہ سمجھا جائے کہ یہ بھی ندوہ میں کسی کے مہمان رہے ہوں گے اور اب ندوی لکھنے لگے ہیں، اس لیے محنت کریئے اور اپنے مقصد کو ہمیشہ سامنے رکھئے، اپنے وقت کی حفاظت کریئے۔

ناقدری کی سزا

آپ استادوں کی بھی قدر کریئے، اس لیے کہ استادوں کی ناقدری سے بھی آدمی محروم ہو جاتا ہے، بہت سے ناقدرے ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے استادوں کی ناقدری کی تو وہ تباہ و برباد ہوگئے، تو ناقدری سے بھی بچیئے اور میں آپ کو ایک زندۂ جاوید واقعہ بتاتا ہوں کہ ایک یہاں استاد تھے تو انہوں نے طالب علمی کے زمانہ میں اپنے استاد مولانا محمد ناظم ندویؒ کے ساتھ ناقدری کا معاملہ کیا تھا تو بہت ہی فاضل تھے، لائق تھے، سب کچھ تھے، لیکن وہ ایسے تباہ ہوئے کہ کسی مدھیہ پردیش کے اسکول میں ہندی کے ماسٹر ہوئے، ان کو کوئی جگہ نہیں ملی، اب وہ مرحوم ہوگئے، تو استادوں کی ناقدری سے بھی آدمی بہت تباہ ہوتا ہے، تو یہ مدرسوں کی بات سمجھئے کہ یہاں کی بدتمیزی، یہاں کی ناقدری آدمی کو دنیا و آخرت میں تباہ کرتی ہے، اور یونیورسٹی و کالجز میں ناقدری ان کو تباہ نہیں کرتی ہے لیکن وہ بھی بری چیز ہے، البتہ یہاں کی ناقدری دینی ناقدری جو ہوتی ہے وہ آدمی کو تباہ کر دیتی ہے، تو کبھی بھی آپ ہمت نہ کریئے گا کہ کسی استاد کی گستاخی یا نگراں کی گستاخی کریں، کڑوا پانی اگر پی لیں گے تو ہمیشہ کام دے گا، لیکن اگر اس وقت آپ نے بے رخی کر دی جلد بازی کر دی تو آپ کی زندگی تباہ ہوگی ہمیشہ ناکام رہیں گے، والدین کی دعا لینا، استادوں کی دعا لینا بہت اہمیت رکھتا ہے اور دنیا میں بھی اس کی قیمت ہے لیکن اتنی قیمت نہیں ہے جیسی اس لائن میں اس کی قیمت ہے۔

تجربہ کی اہمیت

بس میں یہ چند باتیں آپ سے بطور گزارش کہتا ہوں، اور تجربہ کی بات کرتا ہوں، کیونکہ تجربہ بھی ایک بہت بڑا وسیع علم ہے، اور یہ ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ عمر سے وابستہ ہوتا ہے جن کی عمریں زیادہ ہو جائیں گی ان کو تجربہ زیادہ ہو جائے گا اس لیے نہیں کہ وہ بہت عالم فاضل ہیں، بلکہ اس لیے کہ ان کے تجربہ میں ایسی باتیں

آجاتی ہیں جو بڑی قیمتی اور اہم ہوتی ہیں، تو میں اس تجربہ کی بناء پر آپ سے کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنا وقت بچایئے، اس کی قیمت سمجھئے، محنت کریئے اور استادوں کی قدر کریئے، چاہے کوئی کمتر درجہ کا ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی کچھ نہ کہیے، میں آپ کو کمتر درجہ کا ایک واقعہ سناتا ہوں کہ ہمارے یہاں مولانا عبدالماجد صاحبؒ ایک استاد تھے، ان کی کسی لڑکے نے شکایت لکھی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کو کہ فلاں استاد گڑبڑ ہیں، وہ استادی کے لائق نہیں ہیں، یہ اس نے بدتمیزی کی، تو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے ان کو یہ جواب لکھا کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ جو مولانا عبدالماجد جن کی آپ شکایت کررہے ہیں وہ علم میں آپ سے کہیں زیادہ ہیں، تو جتنا زیادہ ہیں اتنا آپ ان سے پڑھ لیجیے اور جتنا کم ہیں اتنا ان کو چھوڑ دیجیے، گویا دبے الفاظ میں یہ کہا کہ کسی استاد کی شکایت نہیں کرنا چاہیے، اگر آپ کے معیار پر کم درجہ کے ہیں تو جو ان کا معیار آپ سمجھتے ہیں اتنا تو ان سے استفادہ کرلیجیے، بقیہ اور لوگوں سے استفادہ کرلیجیے گا، تو یہ شکایت مولانا عبدالماجد صاحب کے یہاں نہیں چلی، کیونکہ وہ بھی تجربہ کار اور جہاں دیدہ آدمی تھے، اور صاحب فیض تھے، اللہ نے ہر طرح سے ان کو نوازا تھا، ان کی بڑی خصوصیات ہیں، اتنی بڑی تفسیر انہوں نے لکھ دی، یہ کوئی کم چیز نہیں ہے، تو جو تجربہ کار ہوتے ہیں محنت کرنے کے عادی ہوتے ہیں جو ان کے کارنامے ہوتے ہیں وہ بلاوجہ نہیں ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا ہے کہ آرام طلبی سے اور آرام کوشی سے وقت کے ضیاع کے ساتھ کوئی بڑا کام کرلے، ایسا نہیں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دیتا ہے وہ وقت کی قیمت بھی سمجھتے ہیں، اپنی جان بھی کھپاتے ہیں اپنی محنت بھی کھپاتے ہیں۔

اصلاح باطن کی ضرورت

آپ ان باتوں سے سبق لیجیے ان کو اپنا نمونہ و آئیڈیل بنایئے، بزرگوں کی کتابیں پڑھئے، ان کے مجاہدے جو سامنے آئیں ان مجاہدوں کو نقل کریئے، اصل فیض تو

بعد کو ہوگا لیکن اپنے اندر نقل بھی کریئے، اور ان مجاہدوں کو سمجھئے کہ ان کی کامیابی کے یہی سب راز ہیں، کامیابی کے طریقے ہیں، ایسے ہی بلاوجہ وہ کامیاب نہیں ہوئے، یا ایسے ہی بلاوجہ کارنامے انہوں نے نہیں کئے ہیں، بلکہ ان کی محنت ومشقت اور لگن اور سب سے بڑی چیز جو تعلق مع اللہ ہے جس کے نہ ہونے سے نری مشقت بھی کچھ کام کی نہیں، آخرت میں وہ کام نہیں آئے گی، آپ محنت کریں گے تو دنیا میں کام آجائے گی، آخرت میں اسی کی قیمت ہے جو اللہ کے یہاں کی قیمت ہے، جو آدمی کے اخلاص، اس کی نیت، اس کے مجاہدہ اور اس کے اندرون کی جو قیمت ہے وہی قیمت اصل ہے، بیرونی قیمت سے کچھ نہیں ہوتا، بیرونی قیمت سے آپ کسی کو متاثر کردیجئے تو متاثر ہونا چندمنٹ کے لیے ہوگا، لیکن اگر آپ باکمال ہیں اور اندرون صحیح ہے تو آپ کوئی انقلاب برپا کرسکتے ہیں، اسی لیے جو انقلاب برپا کرتے ہیں، فوق العادت کام کرتے ہیں، ان کا اندرون بہت ہی اعلیٰ ہوتا ہے اور اللہ کی معیت ونصرت ان کے ساتھ ہوتی ہے اور اللہ کی طرف سے ان کی مقبولیت ہوتی ہے، جب اللہ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس کی محبت عام ہوجاتی ہے، جب اللہ کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو کوئی سواری بھی ساتھ نہیں دیتی، ایک عارف کا قول ہے کہ میں اللہ کی ناراضگی کو اپنی سواری سے سمجھ لیتا ہوں، جب بدکنے لگتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے گناہ ہورہا ہے اور جب وہ رام رہتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اللہ مجھ سے راضی ہے، تو ہر چیز اللہ کے حکم کے تابع ہے، دنیا میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے حکم، اس کی منشاء ومرضی سے ہے، دنیا کا کوئی پتہ بغیر اس کی مرضی کے ہل نہیں سکتا، آپ یقین جمایئے اور اللہ سے تعلق پیدا کریئے، مصنوعی تعلق کام نہیں دے گا، بلکہ حقیقی تعلق ہونا چاہیے، اگر حقیقی تعلق نہیں ہے تو پھر وہ بالکل بے کار ہے، حقیقی تعلق ہو تو وہ آپ کو آگے بڑھائے گا، اور اگر ایسا تعلق ہوا کہ جو آپ کو پیچھے کردے تو یہ آپ کی قسمت۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين.